فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

کے سالِ وصال کی تحقیق

فیروزالدین احمد فریدی

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

کے سالِ وصال کی تحقیق

فیروزالدین احمد فریدی

ISBN 969-8235-06-X

نام کتاب : فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے سالِ وصال کی تحقیق

تحقیق : فیروزالدین احمد فریدی

اشاعت : محرم الحرام ۱۴۲۶ھ/ فروری 2005ء

مطبع : ایجوکیشنل پریس، کراچی

کمپوزر : آدم سعید

اہتمام : سید معراج جامی

قیمت : -/250 روپے

: 10 ڈالر

ناشر

فاطمہ پبلی کیشنز

کھتوال ہاؤس

A-54، سٹریٹ۔ 15

باتھ آئی لینڈ، کراچی 75530

firozuddin_ahmed@yahoo.com

اس حقیر کاوش کو

شیخِ شیوخ العالم، شیخِ کبیر

فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

کے نام نامی منسوب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ترتیب

تقریظ

اولیاء اللہ کے عقیدت مند لاکھوں بلکہ کروڑوں ہیں، ہر ایک اپنی عقیدت میں پختہ اور محبت سے سرشار لیکن راقم الحروف کو ایک ایسے عقیدت مند سے نیاز حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے جس کی عقیدت اور محبت ہر اعتبار سے بے مثال اور لازوال ہے۔ یہ عقیدت منداور شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کی محبت میں سرتا سر ڈوبے ہوئے فیروزالدین احمد فریدی ہیں جو عقیدت اور ادب دونوں کے خاندانی ورثہ دار بھی ہیں۔ فریدی صاحب کے والد مرحوم فصیح الدین احمد اپنے دور کے ممتاز نثر نگار تھے۔ایک ادبی رسالہ بھی شائع کرتے تھے اور دلی کی ہارڈنگ لائبریری کے سکریٹری تھے۔ بڑی فعال شخصیت کے مالک تھے۔ دلی کے ادبی اور علمی حلقوں میں مقبول تھے لیکن جوانی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔فریدی صاحب کے دادا مولوی محمد عالم شاہ فریدی اپنی کتاب ''مزارات اولیائے دہلی'' کی وجہ سے مشہور ہیں۔یہ کتاب ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں شائع ہوئی تھی اور مزارات اولیائے دہلی کے حوالے سے مستند حیثیت رکھتی ہے۔

فریدی صاحب کو شیخ فریدالدین گنج شکرؒ سے غیر معمولی محبت ہے جو عشق کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔ کچھ تو ان کے خاندانی ورثے کی قوت اور کچھ خود ان کی ذاتی شیفتگی اور عقیدت نے اس عشق کو ان کی شخصیت کا اہم ترین حصہ بنا دیا ہے۔ یہ عشق

زبانی کلامی نہیں بلکہ اس عشق میں انہوں نے ایک ایسا قابل قدر علمی کارنامہ بھی انجام دیا ہے جو تاریخ صوفیہ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے لیکن اس کی تفصیل سے پہلے کچھ ابتدائی باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔

اولیاء اللہ سے ہماری عقیدت اور محبت مسلّم لیکن ہم نے ان کے سوانح اور ان کے حالات قلم بند کرنے میں مورّخانہ دیانت، جرح وتعدیل اور حقیقت نگاری سے کام نہیں لیا۔ سارا زور کرامتوں کے زنجیرے بنانے میں صرف کیا۔ اولیاء اللہ کی سیرت کے حقیقی پہلوؤں یعنی تبلیغ و اشاعت اسلام، پیروی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور معاشرے کی روحانی اصلاح کو اُجاگر کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ نئی نسلوں کو یہ نہیں سمجھایا کہ اولیاء اللہ روحانی پیشوا بھی تھے اور معاشرتی مصلح بھی تھے۔ ان کے فیض و اثر سے دل اور روح میں روشنی پیدا ہوئی اور معاشرے میں صلاح وفلاح کی نئی راہیں نکلیں جہاں تک سیرت وسوانح کا تعلق ہے اردو اور انگریزی میں کتابیں مرتب کی گئیں تاہم ایک ہی کتاب میں کسی صفحے پر جو بات درج ہے اس کے متضاد بات دوسرے صفحے پر ملتی ہے۔ تاریخیں بالعموم صحیح نہیں اور حوالے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے بارے میں جو کتاب انگریزی میں مرتب کی ہے اس میں حضرت شیخؒ کا سالِ وصال ۶۶۴ھ درج ہے اور آگے چل کر یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت شیخؒ نے حضرت سلطان جیؒ کو خلافت ۶۶۹ھ میں عطا فرمائی تھی۔ میں نے پروفیسر صاحب سے اپنی آخری ملاقات میں یہ عرض کیا کہ اولیا اللہ کے سلسلے میں سنین کی صحت بہت ضروری ہے اور آپ اس کام کو مورّخانہ طرز سے انجام دے سکتے ہیں۔ پروفیسر نظامی نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور یہ کہا کہ وہ یہ کام جلد انجام دیں گے لیکن ان کا بلاوا آ گیا اور سنین کی صحت نہ ہو سکی۔

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے سالِ وصال کی تحقیق فیروزالدین احمد فریدی کے

لیے مختص تھی۔ حضرت شیخ ؒ کی محبت نے انہیں اس کام پر آمادہ کیا اور انہوں نے یہ کام بڑی خوش دلی، دیانت اور محققانہ جرح و تعدیل سے انجام دیا۔ حضرت شیخ ؒ کے سالِ وصال کا قدیم ترین ماخذ امیر خورد ؒ کی سیر الاولیا کو قرار دیا جاتا ہے اور تاریخ وفات کا قدیم ترین اور مستند ماخذ حضرت سلطان جی ؒ کے ملفوظات کا مجموعہ فوائد الفواد ہے۔ فوائد الفواد کا حوالہ بالکل صحیح ہے لیکن سیر الاولیاء کا حوالہ یوں درست نہیں کہ مطبوعہ چرنجی لال ایڈیشن کے علاوہ سیر الاولیاء کے کسی اور قلمی نسخے میں سالِ وفات کا اندراج متن میں نہیں بلکہ اگر کہیں ہے تو حاشیے پر علیحدہ سے تحریر ہے اور اصل میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سیر الاولیاء کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، تاہم مستند نسخے دو ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا کا نسخہ اور برٹش لائبریری لندن کا نسخہ۔ ان دونوں نسخوں کی تفصیل اوراق مابعد میں ملے گی۔ فریدی صاحب نے سیر الاولیا کے قلمی نسخوں سے استفادے اور تحقیق کا حق ادا کرنے کے لیے لندن اور کول کتا کا سفر کیا۔ دونوں نسخے بچشم خود دیکھے۔ عجائب خانہ کراچی کا نسخہ بھی دیکھا۔ لندن اور کول کتا کا سفر یوں تو معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن علمی ذوق وشوق اور تحقیقی لگن کے اعتبار سے ان اسفار کی بڑی اہمیت ہے۔ مجھے جب فریدی صاحب نے بتایا کہ وہ برٹش لائبریری لندن میں سیر الاولیاء کا نسخہ دیکھنے جا رہے ہیں تو مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی کہ محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پھر جب انہوں نے کول کتے کے سفر کا ارادہ ظاہر کیا تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا کیوں کہ لندن جانا آسان ہے لیکن سفری پابندیوں کی وجہ سے کول کتے کا سفر بہت مشکل ہے، بہر حال انہوں نے اس مشکل کو بھی سر کر لیا اور مزید یہ کہ ان تمام مآخذ کا بغور مطالعہ کیا جو حضرت شیخ ؒ کے ذکرِ انور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بھی مشکل کام اور بڑا کام تھا خصوصاً ایسے شخص کے لیے جس کی ساری زندگی سرکاری دفتروں

میں سر کھپاتے گزری ہو۔

فریدی صاحب نے اپنے مطالعے اور تحقیق کا نتیجہ بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ انہوں نے اپنی رائے اپنے قاری پر نہیں ٹھونسی ہے بلکہ ایک انصاف پسند اور ہوش مند جج کی طرح مسئلے کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لے کر ایک واضح حقیقت بیان کر دی ہے۔ ان کا طرزِ تحریر سادہ اور پُر قوت ہے۔ قاری کی سہولت کے لیے جدولوں اور تقابلی جائزوں سے کام لیا گیا ہے جو تحقیقی اعتبار سے مستحسن ہے۔ میرا خیال ہے کہ فریدی صاحب کی اس کاوش کے بعد حضرت شیخؒ کے سالِ وفات کے تعین میں کوئی ابہام نہیں رہا۔ سال وفات بالکل واضح ہو گیا ہے۔ یہ فریضہ حضرت شیخؒ کے ایک عاشق کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔ یہ بھی بڑی خوشی کی بات ہے اور فریدی صاحب کے لیے باعثِ افتخار بھی ہے۔

فریدی صاحب نے اس ضمن میں حضرت سلطان جیؒ کے سالِ ولادت کا تعین بھی کیا ہے۔ حضرت سلطان جیؒ کے سالِ ولادت کے سلسلے میں جتنے منہ اتنی باتیں والا مسئلہ ہے۔ ۶۳۵ھ سے لے کر ۶۴۷ھ تک یہ سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ فریدی صاحب نے ۶۴۷ھ متعین کیا ہے، تاہم اس سے اختلاف ممکن ہے۔ اصل بات فریدی صاحب کی دیدہ وری، تلاش، جستجو اور عالمانہ انداز ہے۔ جن مسائل کی طرف اب تک سنجیدگی سے توجہ نہیں کی گئی تھی فریدی صاحب نے نہ صرف ان پر توجہ کی بلکہ حقیقت حال کو بھی واضح کر دیا۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ انسان ایسے کارنامے محبت ہی سے انجام دے سکتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ فریدی نے فریدؒ کی محبت کا حق ادا کر دیا ہے۔

جوازِ تالیف

۱۹۹۴ء میں فریدالدین مسعود گنج شکر (بابا صاحب) پر میں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا جو بڑھتے بڑھتے ایک کتابچے کی شکل اختیار کر گیا اور ۱۹۹۵ء میں ''فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی ایک جھلک'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کتابچے کو لکھنے سے پہلے، یا اس کے دوران، میں نے جن چند کتب کا مطالعہ کیا، ان سب میں باباصاحب کا سال وصال ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) بتایا گیا تھا۔ ان کتب میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب **The Life and Times of Shaikh Fariduddin Ganj-I-Shakar** سرفہرست تھی جو بابا صاحب کے بارے میں ایک حوالے کی کتاب سمجھی جاتی تھی، اور ہے۔

اسی کتاب کی بنیاد پر، میں نے اپنے کتابچے میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ھ (۱۲۶۵ء) لکھا۔ اللہ کے کرم اور بابا صاحب کی نظرِ کرم سے ۱۹۹۵ء کے بعد بھی اس کتابچے کے اڈیشن شائع ہوتے رہے جن میں بابا صاحب کا سالِ وصال یہی لکھا جاتا رہا۔

اکیسویں صدی کی آمد پر، جب پانچواں اڈیشن نکالنے کا مرحلہ آیا تو میں نے

ضروری سمجھا کہ اس پر مکمل ناقدانہ نظرثانی کی جائے۔ میری درخواست پر ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا جن کے مطابق مسودے میں تصحیح و ترمیم کی گئی، تاہم بابا صاحب کے سال وصال کے بارے میں چونکہ ڈاکٹر صاحب، تحفظات کے باوجود، کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے، اس لیے انہوں نے بابا صاحب کے درج شدہ سال وصال (۶۶۴ھ) کے بارے میں کوئی اصلاح تجویز نہیں کی۔ جب کتابچے کا پانچواں اڈیشن ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا، تو بابا صاحب کا سال وصال حسب سابق ۶۶۴ھ ہی درج رہا۔

کتابچے کی اشاعت کے بعد، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے ایک بار پھر اس خیال کا اظہار کیا، جس میں ان کا روئے سخن میری طرف نہ تھا، کہ بابا صاحب کا سال وصال تحقیق کا طالب ہے۔ تحقیق اور تاریخ نویسی کبھی میرے شعبے نہیں رہے، علاوہ ازیں جب میں نے بابا صاحب پر خامہ فرسائی کی تھی تو میرا مقصد ان کے چاہنے والوں کو ان کی جھلک دکھانا تھا، ان کی سوانح نگاری نہیں اور ان کے سال وصال کی تحقیق تو قطعاً نہ تھا۔

کتابچے کی اشاعت کے چند روز بعد، ستمبر ۲۰۰۰ء کے اواخر میں، مجھے اپنی والدہ مرحومہ کی برسی پر ملتان جانا ہوا۔ وہاں ایک کتب خانے میں گیا تو ڈاکٹر منظور ممتاز کی کتاب "پیام گنج شکر" نظر آئی۔ دیباچے میں لکھا تھا کہ "تحقیق کا دروازہ تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اس میں ذرا سا اضافہ میں نے بھی کیا ہے جو حضرت باباجی کے وصال کی تاریخ سے متعلق ہے۔" ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب سے چند روز قبل ہونے والی گفتگو میرے دماغ میں تازہ تھی۔ میں نے ڈاکٹر منظور ممتاز کے اس اضافے کو بہت غور اور دلچسپی سے پڑھا۔ مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور الجھ گیا لیکن دل میں ایک خلش چھوڑ گیا۔

یہی خلش ساتھ لیے دو تین روز بعد، میں اکتوبر ۲۰۰۰ء کے پہلے ہفتے میں پاک پتن پہنچا۔ پہلے روز ہی رات کو چشتیاں کے محمد اجمل چشتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بابا صاحب کے سالِ وصال کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ ۶۶۴ھ (۱۲۶۵ء) کی روایت غلط ہے۔ خلش اور بڑھ گئی۔ پے در پے ہونے والے واقعات اس موضوع پر غور وفکر کا اشارہ کر رہے تھے۔ کراچی پہنچا تو محمد اجمل چشتی صاحب کے محبت اور معلومات سے لبریز خطوط لگاتار آنے شروع ہو گئے جن میں بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں مختلف کتابوں کے اقتباسات کی نقول ہوتی تھیں۔ ۲/نومبر ۲۰۰۰ء کے خط میں، اجمل چشتی صاحب نے لکھا:

> ''بابا حضورؒ نے تحقیق و تلاش اور مستند و معتبر احوال و واقعات کے شائع کرانے کا فریضہ آپ کو سونپ دیا ہے اور مفروضہ و جعلی ملفوظات و واقعات کی چھان بین کے لیے آپ کو انتخاب کر لیا ہے''۔

من آنم کہ من دانم۔ اجمل چشتی صاحب نے یہ کلمات مجھے اس کام پر آمادہ کرنے اور میری حوصلہ افزائی کے لیے لکھے تھے۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ میری ناتجربہ کاری اور کم علمی کے باوجود میرے قلم سے بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں ایک مضمون تحریر ہو گیا جس کی تیاری میں ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی اور ڈاکٹر اسلم فرخی نے نہ صرف مجھے اپنے ذاتی کتب خانوں سے استفادہ کا موقع فراہم کیا بلکہ گراں قدر رہنمائی کی۔ مضمون پڑھنے کے بعد، ان دونوں بزرگ محققین نے کہا کہ اسے اشاعت کے لیے برصغیر پاک و ہند کے قدیم اور عظیم علمی اور تحقیقی مجلّے ''معارف'' کو اعظم گڑھ بھیج دیا جائے۔ گو مضمون خاصا طویل تھا لیکن معارف نے اسے، تین اقساط

میں، دسمبر ۲۰۰۱ء، جنوری ۲۰۰۲ء اور مارچ ۲۰۰۲ء میں شائع کر دیا۔

مضمون کا مقصد بابا صاحب کے سالِ وصال کا تعین نہیں تھا۔ جس کے لیے میں خود کو اہل نہیں سمجھتا تھا۔ مقصد محققین کو اس جانب متوجہ کرنا اور تحقیق کو آگے بڑھانا تھا۔ معارف کے دسمبر ۲۰۰۱ء کے شمارے میں، میرے مضمون کے مندرجہ ذیل ابتدائی فقرے میرے اس موقف کی تائید کریں گے:

"ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ کیا عجب کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں اب وہ گھڑی بھی آ گئی ہو جب بابا صاحب کے سالِ وفات پر چھائی ہوئی دھند بھی چھٹ جائے۔ زیرِ نظر مضمون میں بابا صاحب کے سالِ وفات کے بارے میں روایات یک جا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں بعض جگہ راقمِ سطور نے اپنی خام رائے اور تبصرے بھی شامل کر دیے ہیں۔ یہ روایات نقل کرنے اور ان خام تبصروں کے اظہار میں جہاں غلطی ہوئی ہو اور غالباً جگہ جگہ ہوئی ہوگی، اس مضمون کے قارئین ان سے درگزر کر کے ان کی نشان دہی کریں تاکہ ان کی تصحیح ہو اور تحقیق آگے بڑھے جو اس تحریر کا محرک ہے۔"

اس مضمون کے آخر میں، جو معارف کے مارچ ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا، میں نے لکھا:

"محققین کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلکتے اور لندن میں "سیر الاولیاء" کے سترھویں صدی عیسوی میں کتابت ہونے

والے ان دو قدیم قلمی نسخوں کے ان کلیدی اقتباسات کا گہرا اور ناقدانہ مطالعہ کریں جو بابا صاحب کے وصال یا ان کے سنہ وصال سے تعلق رکھتے ہیں .... پنجاب کا محکمہ اوقاف پچھلے چالیس برس سے بابا صاحب اور شیخ بہاء الدین زکریا کے مزارات سے کروڑوں روپے کما چکا ہے۔ کیا یہ محکمہ یا وفاقی یا صوبائی حکومت کا کوئی محکمہ، یونیورسٹی، یا غیر سرکاری ادارہ کسی عقیدت مند، دردمند اور تعلیم یافتہ شخص کو کلکتے یا لندن بھیج کر یہ بنیادی معلومات حاصل نہیں کر سکتا؟''

ان سطور کی اشاعت کو ڈیڑھ برس بیت گیا لیکن نہ کوئی ردِعمل سامنے آیا اور نہ ہی کسی جانب سے کسی پیش رفت کی کوئی خبر ملی۔ اس دوران، میں نے برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمشنر کو، جن سے میری یاد اللہ تھی، کئی خطوط اور ای میل بھیجے اور درخواست کی کہ وہ کسی مناسب آدمی کو برٹش لائبریری لندن بھیج کر مجھے اس مخطوطے یا اس کے کلیدی اقتباسات کی نقل بھجوائیں۔ ہائی کمشنر نے میرے خطوط کے جواب بھی دیئے اور مجھے لندن سے ٹیلی فون بھی کیے لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ کول کتے کے مخطوطے کے لیے ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے کول کتہ اور دلی میں اپنے جاننے والوں کو خطوط لکھے جن کا کوئی جواب نہیں آیا۔ ۱۲/ جون ۲۰۰۳ء کو میں نے مدیر معارف اعظم گڑھ کو خط لکھا کہ اگر کسی صاحب کا جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، کول کتے جانا ہو اور وہ احتیاط سے وہ الفاظ نقل کر سکیں جو کول کتے کے سیر الاولیاء کے مخطوطے میں درج ہیں اور ان کی فوٹو کاپی بھی بھجوا سکیں تو اس سے بابا صاحب کے سال وصال کے تعین میں بہت مدد ملے گی۔ معارف نے، بلا تاخیر، اگلے ہی ماہ جولائی ۲۰۰۳ء کے شمارے میں نہ صرف میرا

پورا خط بلکہ کلیدی اقتباسات کا معلومہ (اور متنازعہ) متن شائع کر دیا اور میرا مکمل پتہ بھی درج کر دیا۔ تاحال کوئی جواب نہیں آیا۔

۷/ جولائی ۲۰۰۳ء کو میں برٹش لائبریری لندن گیا اور لائبریری کے اوقات کار ختم ہونے سے پہلے سیر الاولیاء کے سوا تین سو سالہ قدیم کتابت شدہ مخطوطے سے جملہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب آخری تقابلی جائزے کے لیے کول کتے کے چار سو سالہ پرانے کتابت شدہ مخطوطے سے متعلقہ اقتباسات کے حصول کا مرحلہ رہ گیا تھا۔

اس کام کا بیڑا کراچی کے سید معراج جامی نے اٹھایا جن سے اسی جستجو کے دوران میرا ٹیلی فون پر تعارف ہوا تھا۔ جامی صاحب نے کول کتے اور بھارت میں اپنے جاننے والوں کو خطوط بھی لکھے اور فون بھی کیے۔ یہ عمل مہینوں جاری رہا جس کے دوران میں نے دو چار بار، لمبے وقفوں کے ساتھ، جامی صاحب سے پیش رفت معلوم کرنے کی کوشش بھی کی۔ جب آخری بار گفتگو ہوئی تو جامی صاحب نے کہا، جو درست تھا، کہ وہ اپنے جاننے والوں سے درخواست تو کر سکتے ہیں اور بعد میں یاد دہانی بھی کرا سکتے ہیں لیکن اس کے بعد وہ کیا کر سکتے ہیں؟ اس مسکت جواب کے بعد میں نے مزید پیش رفت دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ چند ماہ مزید بیت گئے۔

۷/ محرم ۱۴۲۵ھ (مطابق ۲۸/ فروری ۲۰۰۴ء) کو مجھے ایک رجسٹر خط ملا۔ کھولا تو اندر سیر الاولیاء کے کول کتے کے مخطوطے کے کلیدی اقتباسات تھے جو انتہائی احتیاط سے نقل کیے گئے تھے۔ یہ کام کول کتے کے ایک نوجوان پی ایچ ڈی مسلم سکالر ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے کیا تھا، جو ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ اقتباسات جامی صاحب کے کول کتا میں مقیم شناسا کے حوالے کیے، جنہوں نے کول کتا

سے کراچی بھجوائے اور جامی صاحب نے یہ اقتباسات رجسٹر خط کے ذریعے مجھے ۵/محرم ۱۴۲۵ھ (مطابق ۲۶/فروری ۲۰۰۴ء) کو روانہ کر دیئے۔ ۵/محرم بابا صاحب کی تاریخ وصال ہے۔

لندن میں سیر الاولیاء کا مخطوطہ تو جولائی ۲۰۰۳ء میں، میں خود دیکھ آیا تھا لیکن کول کتے کے مخطوطے کے اقتباسات پڑھنے کے بعد ایک بنیادی نوعیت کا سوال اور تین چار دیگر ضروری سوالات کے جوابات معلوم کرنا ضروری تھے۔ میں نے (مہینوں بعد) فوراً جامی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور شکریے کے بعد مدعا بیان کیا۔ جامی صاحب نے وہ سوالات اپنے جاننے والوں کو بھارت بھجوا دیئے اور انتظار دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس بار پھر کئی ماہ گزر گئے۔

اگر کوئی کام کسی کے سپرد کیا جائے تو اس شخص سے یہ توقع کرنا حق بجانب ہو گا کہ وہ یہ کام کسی دوسرے کو سپرد کرنے کی بجائے خود سرانجام دے۔ میں نے لندن میں پاکستان کے ہائی کمشنر پر انحصار کیا تو مہینوں انتظار کرتا رہا۔ جب خود گیا تو چند گھنٹوں میں کام تکمیل پا گیا۔ میں نے بھارت کے اسلام آباد ہائی کمیشن کو ویزے کی درخواست دی اور یکم دسمبر ۲۰۰۴ء سے ایک ماہ کا ویزا مانگا۔ ویزا سوا تین ماہ قبل ۲۶/اگست ۲۰۰۴ء سے دے دیا گیا جو ۳۱/اکتوبر کو ختم ہوتا تھا۔ عموماً ویزا اس تاریخ سے دیا جاتا ہے جس تاریخ سے مانگا جائے، یا اس کے بعد کی کسی تاریخ سے دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوا کرتا کہ آپ ویزا دسمبر سے مانگیں اور ویزا تین ماہ قبل اگست سے دے دیا جائے۔ مدعی سست گواہ چست والا مضمون تھا۔ بہرحال مضمون جو بھی تھا، خاصا دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔

بارہ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو، میں ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا میں بیٹھا، سیر الاولیاء کے

چار سو سالہ قدیم مخطوطے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ابھی میں نے چند سطور ہی نقل کی تھیں کہ ایک کھڑے ناک نقشے والا، دبلا، لمبا، باریش نوجوان میرے پاس کی کرسی پہ بیٹھ گیا اور پوچھا کہ آپ کو مطلوبہ کوائف مل گئے۔ میں نے پوچھا: آپ کی تعریف؟ جواب تھا: ڈاکٹر عقیل احمد عقیل۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کو میری یہاں آمد کا علم کب اور کیسے ہوا؟ کہا کہ مہینوں پہلے، کول کتے کے اپنے ایک واقف کار کے کہنے پر، میں نے سیر الاولیاء کے اس قدیم مخطوطے سے چند اقتباسات ڈھونڈ کر نکالے تھے اور نقل کر کے انہیں کسی پاکستانی کو بھیجنے کے لیے دیئے تھے۔ اس کے بعد میرے ان واقف کار نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ آج صبح اچانک مجھے اس کا خیال آیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی یعنی اپنے دفتر پہنچا تو سوسائٹی کے ایک اہل کار مل گئے جو میرے ان واقف کار کے بھی دوست تھے۔ میں نے ایشیاٹک سوسائٹی کے اہل کار سے اپنے واقف کار کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نہ صرف میرے واقف کار بلکہ وہ پاکستانی بھی جن کے لیے یہ اقتباسات میں نے نقل کیے تھے، آج ہی ایشیاٹک سوسائٹی میں آئے ہیں۔ یہ سن کر میں آپ دونوں سے ملنے آ گیا۔ اس مختصر سی گفتگو کے بعد ڈاکٹر عقیل احمد عقیل میرے ساتھ رضاکارانہ طور پر کام میں جت گئے اور تین روز تک جتے رہے۔

کول کتے کے ایشیاٹک سوسائٹی میوزیم میں، مجھے نہ صرف سیر الاولیا کے اس مخطوطے تک رسائی ہوئی جو اس وقت دنیا میں سیر الاولیا کا قدیم ترین قلمی نسخہ ہے جس کی کتابت شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہوئی، بلکہ فوائد الفواد کے عہد عالمگیری میں کتابت شدہ مخطوطے اور مخبر الواصلین کے ڈھائی سو برس پرانے کتابت شدہ قلمی نسخے سے استفادہ کا موقع بھی ملا۔ علاوہ ازیں کول کتے اور دلی سے بعض ایسی مطبوعہ کتابیں ملیں

جن کے بغیر یہ کتاب نامکمل رہتی۔

اس کتاب کی تالیف کا آغاز، مضمون کی صورت میں، اکتوبر ۲۰۰۰ء میں ہوا اور اختتام دسمبر ۲۰۰۴ء میں۔ اس کے ابتدائی مسودے کی کمپوزنگ کا ذمہ میرے سابق پرسنل اسٹنٹ آدم سعید نے رضا کارانہ طور پر لیا۔ آدم سعید نے اس سے قبل کسی اردو کتاب کی کمپوزنگ نہیں کی تھی۔ اس نے یہ کام پورے احساسِ ذمہ داری سے نبھایا اور کئی بار اس مسودے کو، جو مستقلاً ترامیم اور اضافوں کا تختۂ مشق بنا رہا، کمپوز کیا۔ کمپوزنگ کو معیاری کتابی شکل میں منتقل کرنے کے جملہ مراحل سید معراج جامی کی نگرانی میں معراج پر پہنچنے کے بعد اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

بچپن میں کہانی سنی تھی کہ جب اللہ کے دوست حضرت ابراہیم کو جلانے کے لیے آگ کا ہولناک الاؤ دہکایا گیا، تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک چڑیا اپنی ننھی سی چونچ میں پانی کے دو چار قطرے لیے تیزی سے محوِ پرواز ہے۔ کسی نے پوچھا کہ تو کہاں بھاگی جارہی ہے۔ چڑیا بولی کہ تمہیں معلوم نہیں کہ خلیل اللہ کو الاؤ میں ڈالنے والے ہیں۔ میں آگ بجھانے کے لیے پانی لے جارہی ہوں۔ پوچھنے والے نے کہا: اری پگلی! کیا پانی کے یہ دو چار قطرے اس الاؤ کو ٹھنڈا کر دیں گے؟ چڑیا نے جو جواب دیا، بخدا وہی میرا جوازِ تالیف ہے۔

یکم مئی ۱۸۸۵ء کو جب چرنجی لال نے بہت اہتمام سے سیر الاولیاء کا وہ اڈیشن طبع کرایا جو سوا سو سال سے سیر الاولیاء کا چرنجی لال اڈیشن کہلاتا ہے، تو دیباچے کا اختتام ان اشعار پر کیا تھا:

قاریا بر من مکن قہر و عتاب   گر خطائے رفتہ باشد در کتاب
از خطائے رفتہ را تصحیح کن   از کرم واللہ اعلم بالصواب

اس کتاب کے محترم قاری سے میری بھی بس یہی ایک درخواست ہے، جس کے بعد اپنی اس آرزو کا اظہار ہے کہ یہ کتاب بارگاہِ عالیہ فریدیہ میں قبولیت کی سعادت حاصل کرے لیکن

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

فیروز الدین احمد فریدی

کھتوال ہاؤس، کراچی
یکم جنوری ۲۰۰۵ء
۱۹/ ذی قعد ۱۴۲۵ھ

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے سالِ وصال کی تحقیق

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ (بابا صاحب) تیرھویں عیسوی کی چھٹی دہائی میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی جائے ولادت کی طرح، ان کے سالِ وصال کے بارے میں بھی آج تک، یعنی پچھلے سوا سات سو برسوں کے دوران، مختلف اور بعض اوقات متضاد روایات گردش کرتی رہی ہیں۔ ان متضاد روایات کا سب سے حیرت انگیز بلکہ نا قابلِ فہم پہلو یہ ہے کہ بہت سے علماء اور مؤرخین نے، جن میں قدیم اور جدید کی تخصیص نہیں، اپنی کتابوں اور مضامین میں، اگر ایک صفحے پر کوئی سنہ (مثلاً ۶۶۴ھ) بابا صاحب کے سالِ وصال کے طور پر لکھا، تو اُسی تحریر کے کسی دوسرے صفحے پر کسی دوسرے سنہ (مثلاً ۶۶۹ھ) کا بھی یہ کہہ کر ذکر کر ڈالا کہ بابا صاحب اس مؤخر الذکر سنہ (۶۶۹ھ) میں زندہ تھے۔ تاریخِ فرشتہ کے مشہور مصنف محمد قاسم ہندوشاہ، ضیاء الدین برنی کی معروف ''تاریخِ فیروز شاہی'' کے مترجم ڈاکٹر سید معین الحق اور دہلی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے تو کمال ہی کر ڈالا اور ایک ہی صفحے پر، چند سطور میں آگے پیچھے، بابا صاحب کی حیات اور وفات کے بارے میں ایسے متضاد سنین لکھ ڈالے جن کا یک جا ہونا قطعی ناممکن ہے۔ یہ تضادات بدیہی ہیں۔

اگر یہ بدیہی تضاد کسی ایک آدھ کتاب میں ہوتا تو سہو سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا

لیکن جب گزشتہ کئی صدیوں کے دوران، قدیم اور جدید، قلمی اور مطبوعہ، سب ہی کتابوں میں یہ تسلسل سے ہوتا چلا آرہا ہو، تو یہی گمان ہوتا ہے کہ شاید کسی پُر اسرار وجہ سے، بابا صاحب کے صحیح سالِ وصال کے گرد نظر بندی کا ایسا حصار کھینچ دیا گیا کہ بیشتر دیکھنے والے، سب کچھ دیکھنے کے باوجود، حقیقت نہ دیکھ سکے بلکہ ستم یہ کیا کہ خود اپنے قلم سے ان بدیہی تضادات کو اپنی تحریروں میں دہراتے چلے آئے۔

اس کتابچے میں بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں مختلف روایات یکجا کر کے، بابا صاحب کے سالِ وصال کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ راقمِ حروف کی خواہش ہے کہ بابا صاحب کی سرپرستی اور ان کے سب سے محبوب خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاء کی رہنمائی میں اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو۔ اس کامیابی پر شیخ بہاء الدین زکریا کے صحیح سالِ وصال اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے صحیح سنہ ولادت کے تعین کا بھی انحصار ہے۔

بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں چار بنیادی سوالات یہ ہیں:

(I) اکثر عالمانہ کتابوں اور محققانہ مضامین میں، بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) لکھا گیا ہے۔ یہ تحریریں کن کی ہیں اور ان کا ماخذ کیا ہے؟

(II) کیا ۶۶۴ھ صحیح سالِ وصال ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

(III) ۶۶۴ھ کے علاوہ، بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں دیگر کیا روایتیں ہیں؟ وہ کن سے منسوب اور کس حد تک قابلِ اعتبار ہیں؟

(IV) صحیح سالِ وصال کیا ہو سکتا ہے اور اس کی تائید میں کیا اسناد و شواہد ہیں؟

پہلا حصہ

پہلا سوال: ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کا ماخذ کیا ہے اور وہ کون سی تحریریں ہیں جن میں یہ سنہ بابا صاحب کا سالِ وصال قرار دیا گیا ہے؟

بابا صاحب کی تاریخِ وفات بالاتفاق پانچ محرم ہے جس کا ماخذ، اور جس کی سند، ان کے سب سے چہیتے خلیفہ اور عاشقِ صادق خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظاتِ عالیہ ہیں جو خواجہ صاحب کے مرید امیر حسن علاء سجزی نے ۷۰۷ھ سے ۷۲۲ھ (مطابق ۱۳۰۸ء سے ۱۳۲۲ء) کے درمیان، فوائد الفواد میں قلم بند کیے جو علاؤالدین خلجی اور اس کے عیاش بیٹے قطب الدین مبارک کے ادوارِ حکومت تھے۔ یہ تقریباً سات سو سالہ پرانے ملفوظات اتنے مستند تسلیم کیے جاتے رہے ہیں کہ ان کی بنا پر بابا صاحب کی تاریخِ وفات پر کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا، گو جیسا کہ اس مضمون میں آگے ذکر آئے گا، بعض کتابوں میں، جو بیسویں صدی عیسوی میں شائع ہوئیں، کتاب کے مصنف، کاتب یا پروف پڑھنے والے کی سہو سے، بابا صاحب کی یہ غیر متنازعہ تاریخِ وفات بھی غلط لکھ دی گئی اور اگر خوش قسمتی سے خواجہ نظام الدین اولیاء کے مستند ملفوظات کی سند موجود نہ ہوتی تو بابا صاحب کے سنہِ وصال کی طرح ان کی تاریخِ وفات بھی متنازعہ بن سکتی تھی۔

یہاں کسی کو خیال آسکتا ہے کہ جب "فوائد الفواد" میں بابا صاحب کی تاریخِ وفات کا ذکر ہے تو سالِ وصال کا تذکرہ کیوں نہیں ہے۔ اس کی سادہ سی توجیہ یہ

ہے کہ "فوائد الفواد" کے چودہ برس پر محیط یہ لافانی اور لاثانی ملفوظات غیر رسمی نشستوں میں ہونے والی وہ سکون بخش اور دل نشین گفتگو ہے جس کا واحد مقصد روحانی رہنمائی تھا، نہ کہ تاریخ نویسی۔ مشاہدے اور تجربے کی بات ہے کہ جب ہم اپنی غیر رسمی گفتگو میں کسی عزیز کی موت کا ذکر کرتے ہیں تو وفات کے دن یا تاریخ کا ذکر تو آتا ہے، بلکہ وقت کا ذکر بھی آتا ہے، لیکن وفات کے سال یا صدی کا نہیں۔ اگر غیر رسمی گفتگو میں کسی عزیز کی موت کا ذکر کرتے ہوئے، اس کی وفات کے سال، یا انتقال کی صدی کا ذکر آنے لگے تو یہ نہ صرف انتہائی رسمی بلکہ سراسر غیر فطری بھی لگے گا۔ اس نوع کا ذکر آپس کی بات چیت میں نہیں بلکہ رسمی تحریر میں ہوا کرتا ہے اور یہ تحریریں مؤرخوں اور سیرت نگاروں کی ہوتی ہیں، روحانی پیشواؤں کی نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مؤرخوں اور سیرت نگاروں نے بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں کیا لکھا، لیکن اس سے پہلے چند امور پر غور ضروری ہے۔

بیتی صدیوں میں، جب کمپیوٹر تھا، نہ چھاپے خانے تھے، کتابیں لکھنے کے دو طریقے تھے۔ اولاً مصنف اپنے ہاتھ سے کتاب کا پہلا مسودہ لکھتا ہوگا جسے بعد میں کاتب نقل کرتے ہوں گے۔ ثانیاً مصنف کاتب کو کتاب کی املا دیتا ہوگا اور کتاب کی خوش خط کتابت بعد میں کاتب کرتے رہتے ہوں گے۔ گویا زورِ قلم مصنف کا اور قلم کاتب کا۔ اب کاتب کی بجائے کمپیوٹر پڑھیں۔ صدیوں پہلے کتابت شدہ کتابوں کے جو قلمی نسخے آج موجود ہیں، ان کے بارے میں اگر آج وثوق سے یہ کہا جاسکتا کہ وہ عہدِ قدیم کے مصنف کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں، یا یہ کہ کاتب سے کتابت کرانے کے بعد، مصنف نے مسودہ غور سے پڑھ کر اسے درست قرار دیا تو حقائق کی صحت کا ذمے دار مصنف ہوتا، لیکن اگر یہ قدیم قلمی نسخے کاتبوں کے ہاتھوں سے نکلی ہوئی نقول، بلکہ نقول کی نقلیں ہوں، جو مصنف کی وفات کے بعد، صدیوں سے نقل کی

جاتی رہی ہوں تو ان کے اندر پائی جانے والی سہو کا ذمے دار ضروری نہیں کہ مصنف ہی ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ کوئی کاتب ہو۔

اگر کتاب مصنف کے اپنے ہاتھ سے بھی لکھی گئی ہو، تب بھی چار امور پر غور ضروری ہے۔

اولاً بڑے سے بڑے مصنف سے بھی دورانِ تحریر کوئی سہو ہو سکتا ہے۔ ضخیم کتابوں کی بات چھوڑیئے، بعض اوقات مختصر سے خط میں کوئی سہو ہو جائے تو صاحب تحریر، نظرِ ثانی کے دوران، اسے نہیں پکڑ پاتا۔ شاید یہ سہوِ مکرر انسانی نفسیات کے اس چشم کشا پہلو کا عکاس ہو کہ انسان کی نظر اپنی غلطی پر کم ہی پڑتی ہے یا پھر اس امر کا مظہر ہو کہ لکھنے والا اپنی لکھائی اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنے دماغ سے پڑھتا ہے۔

ثانیاً ہر کتاب کی تصنیف کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے۔ مقصد کسی کی پیدائش یا موت کا سال بتانا ہو تو مصنف کی توجہ متعلقہ سنین کی صحتِ بیان پر مرکوز ہو گی۔ اگر مقصد کسی کی سیرت، کسی کا پیغام یا کسی کے بارے میں کوئی اہم واقعہ بیان کرنا ہو تو مصنف کی توجہ اس پر رہے گی، نہ کہ ان سنین پر جن میں یہ بات کہی گئی ہو یا جن میں وہ واقعہ رونما ہوا ہو۔ اگر تحریر میں سنین کا ذکر آئے گا بھی، تو مصنف کی توجہ کا مرکز سنین کی صحتِ اندراج نہیں بلکہ پیغام، سیرت یا واقعات کا صحتِ بیان ہو گا۔

ثالثاً زمانۂ قدیم میں، کسی قلمی کتاب کا نسخہ سامنے رکھ کر، کاتب حضرات جن میں سے بیشتر، آج کی طرح، معاوضے پر کتابت کرتے تھے، جب کتابت کرنے بیٹھتے تھے تو عین ممکن ہے کہ کسی ضخیم کتاب کے اوراق، صبح سے شام تک نقل کرتے ہوئے، ان سے کہیں کوئی لفظ یا فقرہ چھوٹ جاتا ہو، یا فقرے رہ جاتے ہوں اور اعداد کی غلطیوں میں اس قسم کے سہو کے مظاہر دیکھنے کے لیے ہمیں زمانۂ قدیم کی جھریوں میں جھانکنے کی ضرورت نہیں بلکہ دورِ جدید میں بابا صاحب کی دو سوانح ہائے حیات کی صرف دو مثالیں

کافی ہیں جن کا تفصیلی ذکر بعد کے صفحات میں آئے گا۔ ایک سوانح حیات میں جو لاہور کے ایک خاصے جانے پہچانے اشاعتی ادارے نے شائع کی ہے، بابا صاحب کی صدیوں سے غیر متنازعہ تاریخ وفات ''پانچ'' کی بجائے ''نو'' محرم لکھی گئی ہے۔ دوسری سوانحِ حیات میں، ملتان سے تعلق رکھنے والے ایک جانے پہچانے معلم اور مؤرخ نے نہ صرف یہ کہ بابا صاحب کی تاریخ وفات ''پانچ'' کی بجائے ''نو'' لکھی بلکہ ''نو محرم'' کی بجائے ''نو اکتوبر ۶۶۴ھ'' لکھ ڈالی، حالانکہ ہجری تقویم میں اکتوبر کا مہینا نہیں ہوا کرتا۔ جب ایسی غلطیاں بیسویں صدی میں ہو سکتی ہیں تو بیتی صدیوں میں کیا نہ بیتا ہوگا؟

رابعاً یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ بابا صاحب، یا سلسلۂ چشت کے دوسرے مشائخِ عظام، کے بارے میں جو کتابیں ہم آپ آج کل پڑھ رہے ہیں، وہ زیادہ تر پچھلی صدی کے دوران چھپے ہوئے وہ اردو تراجم ہیں جو مترجموں نے ان کتابوں کے فارسی نسخوں کی دستیاب قلمی نقول سامنے رکھ کر کیے ہیں (اور ترجمہ کرتے وقت، بعض اوقات اپنی طرف سے بلا سند، اور بعض اوقات بالکل غلط، بلکہ غیر ضروری اضافے بھی کر ڈالے) اور یہ فارسی قلمی نقول بھی درحقیقت ان اصل قلمی مسودوں کی وہ نقول، اور بسا اوقات نقول در نقول، ہیں جو آج سے کئی صدیوں پہلے، لیکن کتاب کے سنہ تصنیف کے کئی صدیوں بعد، کئی کاتبوں کے ہاتھوں سے نکلنے کے بعد منصۂ شہود پر آئیں۔

اب دیکھتے ہیں کہ وہ کون سی تحریریں ہیں جن میں ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کو بابا صاحب کا سالِ وصال قرار دیا گیا اور ان کے مصنفین کون ہیں؟ یہاں یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ جب مقصد حقیقت کی تلاش اور نظر ناقدانہ ہو تو بعض اوقات اور مقامات پر معروضی تنقید ناگزیر ہو جاتی ہے جو ہرگز قابلِ تنقید نہیں ہے بلکہ معروضی تنقید کا عدمِ اظہار قابلِ تنقید ہے۔

(I) پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم، وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آغاز پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم سے کیا جارہا ہے کیوں کہ انہوں نے بہت محنت اور تحقیق سے، بابا صاحب کے بارے میں، غالباً ۱۹۵۳ء میں، انگریزی زبان میں، ایک فاضلانہ کتاب لکھی جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر صاحب مرحوم فریدی بھی تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل کتاب کا نام ہے: "THE LIFE AND TIMES OF SHAIKH FARID-UD-DIN GANJ-I-SHAKAR"

کتاب کے جس اڈیشن کے حوالے سے بات کی جارہی ہے، وہ یونیورسل بکس لاہور نے شائع کیا۔ سالِ اشاعت کتاب پر درج نہیں۔ کتاب کے پانچ فقرے نیچے درج کیے جاتے ہیں:

(i) صفحہ نمبر ۷۵

(i) In Jamadi I, 664 A.H./1265 A.D., Shaikh Nizam-ud-din visited his master for the last time.

(ii) صفحہ نمبر ۷۵

(ii) On 13 Ramadan 664 A.H/1265 A.D, Shaikh Farid granted his Khilafat Namah to Shaikh Nizam-ud-din Auliya.

(iii) صفحہ نمبر ۱۱۰

(iii) Shaikh Farid expired in 1265 A.D.

(iv) صفحہ نمبر ۵۶

صفحہ نمبر ۱۱۰ کی مزید تفصیل، صفحہ نمبر ۵۶ پر، ان الفاظ میں دی گئی ہے:

(iv) It was 5 Muharram 664 A.H (15 October, 1265).

(v) صفحہ نمبر ۱

دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب کے صفحہ اول پر ہی، پروفیسر خلیق احمد نظامی یہ لکھتے ہیں:

He (BABA FARID) was ...... in his nineties when Balban ascended the throne of Dehli.

اس کتابچے کے دوسرے حصے میں، تاریخی حوالوں کے ذریعے، یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بلبن (جمادی الاولیٰ) ۶۶۴ھ، مطابق (فروری) ۱۲۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اگر بابا صاحب ۱۲۶۶ء میں زندہ تھے تو وہ ۱۲۶۵ء میں انتقال کیسے کر سکتے ہیں؟ یہ پہلا بدیہی تضاد ہے۔ دوسرے بدیہی تضاد کا ذکر آگے آئے گا۔

اس کتاب کی تصنیف کے تقریباً تیس برس بعد، ۱۹۸۳ء میں، محمد حفیظ اللہ نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو لاہور کے اشاعتی ادارے "المعارف" گنج بخش روڈ، لاہور نے بعنوان "احوال و آثارِ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ" شائع کیا۔ فاضل مترجم نے پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی انگریزی زبان کی کتاب کی بعض غلطیوں کی تصحیح اور قابلِ توضیح باتوں کی وضاحت، اپنے اردو ترجمے میں، زیریں حاشیے (FOOT NOTES) کی مدد سے کی۔ مذکورہ بالا پانچ انگریزی فقروں میں بھی، مترجم کو وضاحت کی جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی، وہ انہوں نے اپنے اردو ترجمے میں کر دی۔ یہ وضاحتیں مندرجہ ذیل سطور میں، قوسین میں درج ہیں:

(i) صفحہ نمبر ۱۵۸

جمادی الاول ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء میں شیخ نظام الدین اولیاء (تیسری اور) آخری بار بابا صاحبؒ سے ملنے (اجودھن) گئے۔

(ii) صفحہ نمبر ۱۵۹

۱۳ رمضان المبارک ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء کو بابا صاحب نے شیخ نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ عطا فرمایا۔

(iii) صفحہ نمبر ۲۲۰

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ ۱۲۶۵ء میں واصل بحق ہوئے۔

(iv) صفحہ نمبر ۱۲۳

پانچ محرم الحرام ۶۶۴ھ کا دن تھا (۱۵/ اکتوبر ۱۲۶۵ء)

(v) صفحہ نمبر ۲۴

جب بلبن تخت نشین ہوا تو آپ کی عمر نوے سال سے اوپر تھی۔

مندرجہ بالا ترجمے سے واضح ہوتا ہے کہ فاضل مترجم کو بابا صاحب کے سالِ وصال کے ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) ہونے کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ تھا، ورنہ وہ قوسین میں، یا اپنے ترجمے کے زیریں حواشی (FOOT NOTES) کے ذریعے، اس بارے میں اپنے تحفظات کا ضرور اظہار کر دیتے۔

ان اقتباسات پر ایک نظر ڈالتے ہی ایک اور بدیہی تضاد ابھرتا ہے۔ محرم قمری سال کا پہلا، جمادی الاولیٰ پانچواں اور رمضان نواں مہینا ہوتا ہے۔ اگر بابا صاحب نے رمضان ۶۶۴ھ میں خواجہ نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ عطا کیا تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بابا صاحب نے، نو مہینے پہلے، محرم ۶۶۴ھ میں رحلت فرمائی ہو۔ یہ دوسرا تضاد بھی اتنا بدیہی ہے کہ مؤرخ یا محقق کی تو بات چھوڑیں، ایک عام قاری بھی اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اگر بابا صاحب کی زندگی اور زمانے پر، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی لکھی ہوئی معرکہ آرا کتاب روایتی سیرت نگاری ہوتی تو اس پر ہمارا محتاط تبصرہ وہی ہوتا جو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے، اپنی مندرجہ بالا کتاب میں، جا بجا روایتی سیرت نگاری کی

بعض غیر محتاط کتابوں پر کیا ہے لیکن پروفیسر صاحب مرحوم نے اپنی اس عالمانہ اور محققانہ تصنیف میں بابا صاحب اور سلسلہ چشت کے دوسرے صوفیائے عظام سے منسوب غیر مصدقہ روایات، جعلی ملفوظات اور جعلی تصانیف کا جس طرح بھانڈا پھوڑا ہے اور اپنی کتاب میں درج شدہ کوائف اور سنین کی تصدیق و تائید میں جس احتیاط سے ہر جگہ زیریں حاشیوں (FOOT NOTES) میں مآخذ کے حوالے دیئے ہیں، اس کے پس منظر میں،اور پروفیسر صاحب مرحوم کے مسلمہ علمی اور محققانہ مقام کے پیشِ نظر، ان ناممکن تاریخوں کا ان کی کتاب میں، جو بابا صاحب کے بارے میں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے، جمع ہو جانا عجیب سا لگتا ہے۔

پروفیسر نظامی کی وفات سے کچھ عرصے قبل، ادارہ ادبیات دلّی نے، ۱۹۹۸ء میں، اس کتاب کا نظر ثانی شدہ (اور تا حال آخری) اڈیشن کئی ترامیم اور اضافوں کے ساتھ شائع کیا جس میں پروفیسر صاحب نے بابا صاحب کے بارے میں بعض انتہائی اہم موضوعات پر اپنی سابقہ آراء میں بنیادی تبدیلیاں کیں (جو اس کتاب کا موضوع نہیں)۔ تاہم بابا صاحب کے سالِ وصال کے موضوع پر وہ، ۱۹۹۸ء میں بھی، نہ صرف اپنی ۴۳ سالہ پرانی رائے پر قائم رہے بلکہ اس کے بارے میں ایسی قطعیت کا اظہار کیا جو پہلے نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک جھلک نیچے پیش ہے۔

۱۹۵۵ء کے اڈیشن کے صفحات نمبر ۵۶، ۷۵ اور ۱۱۰ پر بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں، جو کچھ جن الفاظ میں لکھا گیا تھا، اور جو اس کتاب کے پچھلے صفحات پر نقل کیا گیا ہے، وہ سب ۱۹۹۸ء اڈیشن کے صفحات نمبر ۶۳، ۱۴۰، ۱۴۱/ اور ۱۴۶ پر من وعن موجود ہے، تاہم ۱۹۵۵ء کے اڈیشن کے صفحہ نمبر ا پر، بابا صاحب کو بلبن کے دورِ سلطانی میں زندہ دکھا کر، ۱۹۵۵ء کے اڈیشن میں جو بدیہی تضاد پیدا ہو گیا تھا، اسے ۱۹۹۸ء کے اڈیشن میں حذف کر کے یہ تضاد دور کرنے کی کوشش کی گئی جو (جیسا کہ ہم

بعد میں دیکھیں گے) ناکام رہی اور تضاد موجود رہا۔

بلبن کے بارے میں، پروفیسر صاحب نے ۱۹۹۸ء کے اڈیشن میں اپنی قطعی رائے کا اظہار اس طرح کیا:

(۱) ۱۹۹۸ء اڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۲۰ کا زیریں حاشیہ نمبر ۷ (ترجمہ)

"شیخ (بابا صاحب) بلبن کی تخت نشینی سے پہلے وفات پا چکے تھے۔"

(۲) ۱۹۹۸ء اڈیشن کا ضمیمہ نمبر "I"۔ صفحہ نمبر ۱۷۲

اس ضمیمے میں بابا صاحب کے ہم عصر آٹھ سلاطینِ دہلی کے نام دیئے گئے ہیں جن میں بلبن کا نام نہیں۔ آخری نام سلطان ناصر الدین محمود کا ہے۔

بلبن کے بارے میں اس قطعی رائے کے اظہار کے بعد، پروفیسر صاحب نے ۱۹۹۸ء اڈیشن کے صفحہ نمبر ۶۹ پر وہی متضاد بات لکھی جو ۴۳ برس پہلے ۱۹۵۵ء کے اڈیشن میں موجود تھی۔ درج ذیل سطور میں، قاضی محمد حفیظ اللہ کے اردو ترجمے "احوال و آثار شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر" (۱۹۸۳ء) کے صفحات نمبر ۱۳۱/ اور ۱۳۲ سے متعلقہ اقتباس پیش ہے:

"کہا جاتا ہے کہ چشت میں سجادہ نشینی کے بارے میں کوئی تنازعہ تھا۔ خواجہ زور اور خواجہ غور چشت سے دہلی تشریف لائے تا کہ شیخ علی چشتی کو راضی کر کے واپس گھر لے جائیں تا کہ وہ اپنے مرحوم بھائی کے سجادہ نشین بنیں۔ بلبن شیخ علی چشتی کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر شیخ (علی چشتی) چلے گئے تو وہ تخت و تاج سے دستبردار ہو جائے گا۔ دونوں فرستادہ واپسی پر اجودھن سے گزرے تو شیخ فرید (بابا صاحب) نے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔"

بلبن کے بارے میں بیانات کا جو تضاد ۱۹۵۵ء میں تھا، وہ ۱۹۹۸ء میں بھی

برقرار رہا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اپنی معروف کتاب کی اولیں اشاعت (۱۹۵۵ء) کے ۴۳ برس بعد بھی، جب اس کتاب کے نہ صرف کئی اڈیشن بلکہ ترجمے بھی شائع ہو چکے تھے، پروفیسر نظامی نے بابا صاحب کے سالِ وصال کے ضمن میں اس بدیہی تضاد کو جو ان کی کتاب کے پہلے اڈیشن میں تھا، اس کے آخری نظرِ ثانی شدہ اڈیشن میں کیوں جگہ دی اور ایک ایسی رائے پر قطعیت سے کیوں قائم ہو گئے جس کی تائید میں انہوں نے کوئی ثبوت بلکہ تاریخی حوالہ بھی پیش نہیں کیا لیکن جس کی تردید میں معتبر مورخین کے ایسے بیانات موجود ہیں جن کی شہادت تاریخی واقعات سے ہوتی چلی آئی ہے۔

بابا صاحب کی زندگی اور زمانے پر، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی کتاب چونکہ ایک حوالے کی کتاب کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے، اور ہوتی رہے گی، اس لیے ریکارڈ درست رکھنے کے لیے، یہ بتانا ضروری ہے کہ اس محققانہ تصنیف میں حقائق کی یہ واحد واضح لغزش نہیں۔ اس کے صفحات نمبر ۱۲۳ اور ۱۲۴ پر بھی اسی طرح کی ایک دو مزید نہ ہونے والی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ کتاب کا صفحہ نمبر ۱۲۳ کتاب کا ضمیمہ "د" یعنی "D" ہے جس میں بابا صاحب کے سجادہ نشینوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اس فہرست میں دو قسم کی غلطیاں ہیں۔ اولاً فہرست میں درج شدہ تعداد غلط ہے۔ ضمیمے میں صرف پچیس سجادہ نشینوں کے نام دیئے گئے ہیں حالاں کہ کتاب کی اشاعت کے وقت، یعنی ۱۹۵۵ء میں، اٹھائیس سجادہ نشین ہو چکے تھے اور اٹھائیسویں سجادہ نشین ۲۵ دسمبر ۱۹۳۴ء سے، یعنی کتاب کے سالِ اشاعت سے بیس برس پہلے سے، گدی نشین تھے۔ ثانیاً ضمیمے میں بہت سے نام غلط یا نامکمل ہیں۔ مثلاً نمبر شمار ۲۵ پر پچیسویں سجادہ نشین کا نام (جو اس ضمیمے میں، ایک ناقابلِ فہم غلطی سے، آخری سجادہ نشین ظاہر کیے گئے تھے) شیخ شرف الدین لکھا گیا ہے جو پیر فتح محمد ہونا چاہیئے تھا۔ کم از کم چار مقامات پر، سجادہ نشینوں کے نام نامکمل ہیں۔ مثلاً تین جگہ یعنی نمبر شمار ۸، ۱۱ اور ۱۶ پر، سجادہ نشینوں کا نام صرف 'شیخ محمد' لکھا

گیا ہے، جب کہ ان کے نام علی الترتیب نمبر شمار ۸ پر شیخ محمد یونس، نمبر شمار ۱۱ پر شیخ محمد شہاب الدین اور نمبر شمار ۱۶ پر شیخ محمد حامد ہونے چاہیئے تھے۔ محمدؐ کے بابرکت نام سے یہ نام شروع ضرور ہوتے ہیں، تاہم اصل نام یونس، شہاب الدین اور حامد تھے۔ اسی طرح نمبر شمار ۹ پر، سجادہ نشین کا نام صرف ''شیخ احمد'' لکھا گیا ہے جب کہ پورا نام ''شیخ محمد احمد شاہ'' ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم نے اپنے اس ضمیمے یا فہرست کا ماخذ نہیں لکھا جس سے قدرتی طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ فہرست پروفیسر صاحب نے اپنی ذاتی اور مصدقہ معلومات کی بنا پر مرتب کی ہوگی۔ اگر یہ خیال یا مفروضہ درست ہو تو فہرست میں پائی جانے والی غلطیوں کی نوعیت، اور تعداد، کے پیشِ نظر، ان اغلاط کی ذمے داری کاتب یا پروف پڑھنے والے پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ واضح رہے کہ اس فہرست کے مندرجات کی تصدیق آسانی سے پاک پتن سے کی' یا کرائی' جاسکتی تھی۔ پروفیسر نظامی صاحب کے سگے بھائی کراچی میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر تھے۔

۱۹۹۸ء ضمیمہ ''ڈ'' کی تصحیح کا بہترین، اور آخری، موقع تھا۔ تاہم ۱۹۹۸ء کے نظر ثانی شدہ اڈیشن میں تقریباً وہ سب ہی اغلاط اور خامیاں پائی جاتی ہیں جن کی پچھلی سطور میں نشان دہی کی گئی تھی۔ ۱۹۹۸ء کے اڈیشن میں ۲۵ کی بجائے ۲۶ سجادہ نشینوں کے نام ہیں۔ ۲۶ واں اور آخری نام شیخ غلام قطب الدین کا ہے جو ۱۹۸۶ء میں وفات پاچکے تھے، تاہم ۱۹۹۸ء میں بھی انہیں آخری سجادہ نشین ظاہر کیا گیا ہے اور ان کے جانشین کا جو پچھلے بارہ برس سے، ۱۹۸۶ء سے، سجادہ نشین تھے، نام نہیں دیا گیا۔ اس طرح ۱۹۹۸ء کی یہ فہرست جو اس اڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۶۳ پر ضمیمہ ''ڈ'' میں دی گئی ہے، بدستور نامکمل اور غلط رہی۔

اب صفحہ نمبر ۱۲۴ پر آیئے جو کتاب کا ضمیمہ ''ہ'' یعنی "E" ہے اور بابِ جنت کے بارے میں ہے۔ بابا صاحب کی خواب گاہ کے جنوب میں واقع پونے چھ فٹ اونچا

اور ڈھائی فٹ چوڑا یہ تنگ دروازہ صدیوں سے برِصغیر پاک و ہند میں ایسی شہرت کا حامل رہا ہے جو آج تک دنیا میں کسی اور دروازے کو نہیں ملی۔ پروفیسر صاحب مرحوم نے اس ضمیمے کا عنوان ''بہشتی دروازہ'' دے کر، اس کے بارے میں ذکر کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک جونیئر انگریز افسر کیپٹن ویڈ (CAPTAIN WADE) کا انتخاب کیا ہے جس کی اغلاط سے پُر یہ تحریر کوئی پونے دو صدی پہلے، ۱۸۳۷ء میں، ایشیاٹک سوسائٹی کے قدیم مجلّے میں کول کتے سے شائع ہوئی۔ خدا جانے ''بابِ جنت'' کے بیان کے لیے، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم نے اپنی محققانہ اور حوالے کے طور پر استعمال ہونے والی کتاب میں اتنے جونیئر غیر مسلم افسر کی ایک اتنی پرانی تحریر کا انتخاب کیوں کیا جب کہ وہ تحریر بدیہی اغلاط سے بھی پُر ہے۔ اس کی صرف ایک مثال یہ فقرہ ہے جو اتفاق سے اس ضمیمے کا سب سے پہلا فقرہ ہے:

> ''جس کمرے میں بابا صاحب مدفون ہیں، اس کے دو دروازے ہیں، ایک شمال میں اور دوسرا مشرق میں۔ مشرقی دروازے کو بہشتی دروازہ کہتے ہیں۔''

پروفیسر صاحب مرحوم کی کتاب کے مترجم قاضی محمد حفیظ اللہ نے، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، اپنے ترجمے کے صفحہ نمبر ۲۴۱ پر، مندرجہ بالا فقرے کا ترجمہ دینے کے بعد، یہ زیریں حاشیہ (FOOT NOTE) لکھا ہے:

> ''یہاں مصنف سے سہو ہو گیا ہے۔ مزار کے دو دروازے ہیں۔ ایک مشرق کو جو مزار کا اصل دروازہ ہے اور ایک جنوب کو جس کو بہشتی دروازہ کہتے ہیں۔''

ایک معلم، مؤرخ، محقق اور بابا صاحب ے خاندان سے نسبت رکھنے والے عقیدت مند سے یہ توقع غالباً بے جا نہ ہوگی کہ وہ بابا صاحب کی خواب گاہ پر، کم از کم

ایک بار، ضرور حاضری دیتا، خصوصاً جب کہ وہ ان کی ذات اور زمانے پر ایک محققانہ کتاب لکھ رہا ہو۔ بیسویں صدی عیسوی میں علی گڑھ سے پاک پتن آنا بھلا کون سا مشکل کام تھا؟ اگر پروفیسر صاحب مرحوم، تحقیق کے ناطے ہی سہی، ایک بار پاک پتن آتے تو ناممکن تھا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک جونیئر انگریز افسر کی اتنی پرانی اور اتنی غلط تحریر کو اتنی اہمیت دیتے کہ اسے، تصحیح کے بغیر، حوالے کے طور پر، من وعن اپنی محققانہ کتاب کا ضمیمہ بنا لیتے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس انگریز نے بابا صاحب کی خواب گاہ کے دو دروازوں کا ذکر کیا ہے اور دونوں کا ہی ذکر غلط کیا ہے۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ جب اندرونی آنکھ نہ ہو تو بیرونی آنکھ بعض اوقات غلط دیکھتی اور دکھلاتی ہے۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ بابا صاحب کی خواب گاہ کے شمال میں کوئی دروازہ نہیں بلکہ ایک دیوار ہے جس میں خواتین کے لیے جالیاں بنائی گئی ہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے اصل دروازے یعنی جنوبی دروازے کا ذکر تک نہیں کیا جو بہشتی دروازہ کہلاتا ہے اور تیسری غلطی یہ کہ اس نے مشرقی دروازے کو بہشتی دروازہ قرار دیا ہے، حالانکہ جنوبی دروازہ اس نام سے صدیوں سے، دنیا بھر میں مشہور ہے۔

۱۹۹۸ء میں، جب اس کتاب کا نظر ثانی شدہ اڈیشن شائع ہوا تو وہ یہ فاش غلطی دور کرنے کا بہترین، اور آخری، موقع تھا۔ تاہم اس اڈیشن میں، صفحہ نمبر ۱۶۴ پر، ضمیمہ "ہ" یا "E" میں، حسبِ سابق، اس جونیئر انگریز افسر کا حقائق سے برعکس وہی پورا بیان، کسی تصحیح یا تبصرے کے بغیر، پھر شامل کر دیا گیا جو ۱۹۵۵ء کے اڈیشن میں تھا۔ پروفیسر نظامی کا یہ ناقابلِ فہم فیصلہ ایک محقق، مؤرخ اور عالم کی بہترین روایات کے مطابق نہ تھا اور ایک عظیم صوفی کے بارے میں ایک تحقیقی کتاب کے ۴۳ برس بعد شائع ہونے والے نظر ثانی شدہ اڈیشن میں، اس بیان کو من وعن شامل کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

ایسا لگتا ہے کہ پروفیسر صاحب مرحوم کی محققانہ اور ناقدانہ نظر زمانہ قدیم کی مشہور کتب کی ان غلط بیانیوں اور بے سروپا روایات پر تو بھرپور پڑی جو مسلمان سیرت نگاروں اور خوش عقیدہ مریدوں سے، صدیوں سے، منسوب چلی آرہی تھیں لیکن جب انہوں نے "JOURNAL OF THE ASIATIC SOCIETY OF BENGAL" کا نام پڑھا اور اس میں ۱۸۳۷ء کی یہ تحریر پائی تو انہوں نے اس انتہائی غلط تحریر کی تصدیق کے بارے میں معمولی سی تحقیق کی بھی وہ بنیادی ضرورت محسوس نہ کی جو ایک محقق اور مؤرخ کے طور پر وہ مسلمان سیرت نگاروں اور راویوں کی قدیم تحریروں کے بارے میں، بجا طور پر، کرتے چلے آرہے تھے۔ اور پھر یہاں تو کسی لمبی چوڑی تحقیق کی بھی ضرورت نہ تھی۔ دروازہ موجود تھا، ہے، اور انشاء اللہ رہے گا۔ ضرورت صرف اسے خود جا کر دیکھنے کی تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی انگریزی زبان میں یہ کتاب اس موضوع مسعود پر، کسی زبان میں، پہلی اور تا حال آخری، عالمانہ محققانہ تصنیف تھی، اور ہے۔ اس بنا پر ان سے یہ توقع رکھنا بے جا نہ تھا کہ وہ ایک عظیم مسلم دانش گاہ اور درس گاہ کے محترم معلم، محقق، مؤرخ اور بابا صاحب کے خانوادے سے نسبت رکھنے کے ناطے، بابا صاحب کے (غلط) سالِ وصال کو ایک سے زیادہ بار اپنی محققانہ تصنیف میں جگہ دینے سے پہلے، ایک محقق، مؤرخ اور ناقد کی نظر سے یہ جانچنے کی کوشش کرتے کہ یہ سالِ وصال تاریخ کی کسوٹی پر پورا بھی اترتا ہے کہ نہیں؟ اگر برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا کوئی مشہور اور مستند واقعہ وضاحت سے یہ بتا رہا ہو کہ جس سنہ میں یہ مسلمہ واقعہ وقوع پزیر ہوا، اس سنہ میں بابا صاحب زندہ تھے، یا جس قدیم ماخذ کو بنیاد بنا کر، پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب میں، بابا صاحب کا سالِ وصال ۱۲۶۵ء مطابق ۶۶۴ھ لکھا، اسی قدیم ماخذ میں ہی ایک سے زیادہ بار صراحتاً یہ ذکر ہو، اور یہ ذکر

پروفیسر صاحب کی ناقدانہ اور ماہرانہ نظر سے نہ صرف گزرا ہو بلکہ ان کے اپنے قلم سے ان کی اپنی کتاب میں درج بھی ہوا ہو کہ بابا صاحب (محرم) ۶۶۴ھ کے بعد زندہ تھے تو پروفیسر صاحب مرحوم کو، اپنی محققانہ کتاب میں، ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کے سالِ وصال کے طور پر بار بار لکھنے سے اجتناب کرنا چاہیئے تھا اور اس بدیہی تضاد کی اپنی کتاب میں کم از کم ۱۹۹۸ء میں نشان دہی ضرور کر دینی چاہیئے تھی، جو مثلاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم نے (جن کا ذکر بعد میں آئے گا) اپنی کتاب میں، ۱۹۶۲ء میں کی۔

ہم تو یہ کہیں گے کہ اگر بابا صاحب کے سالِ وصال کا تعین پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کے ہاتھوں ہوتا (خواہ وہ ۱۹۹۸ء میں ہی ہوتا)، تو یہ پروفیسر صاحب کا فرض بھی بنتا تھا اور حق بھی۔ پروفیسر صاحب نے بابا صاحب پر بہت محنت سے جو کتاب (غالباً) ۱۹۵۳ء میں لکھی اور ۱۹۵۵ء میں چھپوائی، اس کا کچھ اجر تو پروفیسر صاحب مرحوم کو اس جہان میں ہی مل گیا۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر اور شام میں بھارت کے سفیر ہوئے جو ہر چند کہ اعلےٰ مناصب ہیں، لیکن دنیاوی، عارضی اور ادنےٰ ہیں۔ تاہم ان کی تصانیف، خصوصاً بابا صاحب پر ان کی انگریزی کتاب، آج دنیا میں ایک مقام اور حوالے کی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر پروفیسر صاحب مرحوم بابا صاحب سے منسوب بعض دیگر متنازعہ روایات کے بارے میں، جن میں بابا صاحب کا سالِ وصال بھی شامل ہے، ایک محقق اور مؤرخ کی حیثیت سے، اپنے قلم سے، اپنی وقیع رائے کا اظہار کر جاتے تو یہ بابا صاحب کے چاہنے والوں پر' پروفیسر صاحب مرحوم کا احسان ہوتا جو قیامت تک صدقہِ جاریہ کے طور پر قائم رہتا۔

جو بھول چوک (غالباً) ۱۹۵۳ء میں، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم سے ہوئی، وہی تیس برس بعد، ان کی کتاب کے فاضل مترجم قاضی حفیظ اللہ سے ۱۹۸۳ء میں ہوئی جنہوں نے ''بابِ جنت'' کے بارے میں، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی انگریزی کی

کتاب میں پائی جانے والی غلطی کی نشان دہی تو اپنے اردو ترجمے کے صفحہ نمبر ۲۴۱ کے زیریں حاشیے کے ذریعے کردی لیکن بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں مندرجہ بالا انگریزی کی کتاب میں جو واضح تضادات پائے جاتے تھے، ان پر فاضل مترجم کی نظر بھی نہ پڑی، ورنہ وہ "بابِ جنت" کی طرح اپنے ترجمے میں، زیریں حاشیے دے کر، سالِ وصال کے بارے میں ان تضادات کی نشان دہی بھی کرتے۔

(II) پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی، شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی

پروفیسر نثار صاحب دہلی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے فاضل استاد ہیں، باباصاحب کے خانوادے سے ہیں، بابا صاحب اور سلسلۂ چشت کے بزرگان کے عقیدت مند ہیں اور ان پر تحقیقی کام کرچکے ہیں۔ اس طرح ان کا بابا صاحب سے تعلق صرف خاندانی ہی نہیں بلکہ علم کے ناطے سے بھی ہے اور عقیدت کے حوالے سے بھی۔

ستمبر ۱۹۷۴ء میں، ماہنامہ "منادی" دہلی نے، جس کے مالک اور مدیر خواجہ حسن ثانی نظامی ہیں، ایک خصوصی نمبر 'حضرت بابا فرید نمبر' کے نام سے نکالا۔ پروفیسر نثار صاحب نے اس خصوصی نمبر میں، اپنے علم و تحقیق کی بنیاد پر، مختلف عنوانات کے تحت سات مضامین لکھے، جن میں سے چار مضامین میں، کم از کم نو مختلف مقامات پر، باباصاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) قرار دیا۔ دو مقامات یعنی ماہنامہ منادی کے صفحات نمبر ۱۸۱ اور ۱۹۵ پر تو انہوں نے اپنی جچی تلی اور حتمی رائے کا آغاز یہ کہہ کر کیا کہ "ہمیں معلوم ہے" کہ باباصاحب نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔ وہ اپنی اس (غلط) رائے پر اتنے مستحکم تھے کہ ماہنامہ منادی کے مندرجہ بالا شمارے کے صفحہ نمبر ۲۰۳ کے زیریں حاشیے پر، انہوں نے ساڑھے چھ سو برس قبل لکھے جانے والی

کتاب 'سیر الاولیاء' کے ان بیانات کو غلط قرار دیا کہ بابا صاحب ۶۶۹ھ (۱۲۷۰ء) میں زندہ تھے۔ 'سیر الاولیاء' کے یہ بیانات اس کتاب کے چوتھے حصے میں درج ہیں اور اس کتاب کی جان اور اس کے نتائج کی بنیاد ہیں۔

ماہنامہ منادی دہلی میں شائع ہونے والے ان مضامین سے، بارہ اقتباسات یہ ہیں:

(i) صفحہ نمبر ۱۳

''حضرت بابا فریدؒ'' کے عنوان سے اپنے پہلے مضمون میں، پروفیسر نثار صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت بابا فریدؒ نے ۶۶۴ھ یعنی ۱۲۶۵ عیسوی میں ۔۔۔انتقال فرمایا۔''

(ii) صفحہ نمبر ۱۳

''بابا صاحب کے آخری زمانۂ عمر میں سلطان غیاث الدین بلبن حکمران تھا۔''

یہاں ایک بار پھر یہ بتانا ضروری ہے کہ بلبن فروری ۱۲۶۶ء میں سلطان بنا۔ اگر بابا صاحب ۱۲۶۶ء میں زندہ تھے تو وہ ۱۲۶۵ء میں انتقال کیسے فرما سکتے ہیں؟ اس تضاد پر اگلے صفحات میں تفصیلی تبصرہ کیا جائے گا اور ضروری نتائج اخذ کیے جائیں گے۔ یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ یہ بدیہی تضاد ایک ہی صفحے (یعنی نمبر ۱۳) پر موجود ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی کتاب کے تضادات مختلف صفحات پر تھے اور ہیں، ایک صفحے پر نہیں۔

(iii) صفحہ نمبر ۱۳۹

اپنے دوسرے مضمون میں جو 'راحت القلوب ۔ ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے ہے، پروفیسر نثار صاحب لکھتے ہیں:

''امیر خورد (کرمانی) دوسرے موقع پر لکھتے ہیں: سلطان المشائخ نے اپنے

قلم مبارک سے لکھا ہے کہ شیخ الشیوخ حضرت بابا فریدؒ نے کاتبِ حروف کو بلایا، جمعہ کے دن نماز کے بعد، ۲۵ جمادی الاول ۶۶۹ھ کو ۔۔۔ اور فرمایا، تمہیں دین اور دنیا دے دی، یہاں تو یہی کچھ تھا۔ جاؤ ملک ہندوستان (کی ولایت) لے لو۔'' واضح رہے کہ امیر خورد کرمانی ''سیر الاولیاء'' کے مصنف ہیں جس کا تفصیلی ذکر اگلے صفحات میں ہے۔

اسی صفحے (صفحہ نمبر ۱۳۹) کے زیریں حاشیے نمبر ۲ میں، پروفیسر نثار صاحب لکھتے ہیں:

''یعنی یہ ۲۵ جمادی الاول ۶۶۹ھ کا واقعہ ہے۔ اس تاریخ کو، حضرت محبوبِ الٰہی اجودھن میں حضرت بابا صاحب کی خانقاہ میں مقیم تھے اور بابا صاحب بقیدِ حیات تھے مگر یہاں تاریخ میں کچھ غلطی واقع ہوئی ہے کیوں کہ حضرت بابا صاحب کا انتقال ۵ محرم ۶۶۴ھ کو ہوا ہے۔

(اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۳۲ھ، ص ۵۴)''

غلطی کس سے ہوئی، یہ یہاں بھی ظاہر ہے، اور آگے تو ثابت ہو جائے گا۔

(iv) صفحہ نمبر ۱۴۳

''راحت القلوب۔ ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے، اسی مضمون کے صفحہ نمبر ۱۴۳ پر تحریر ہے:

''بابا صاحب کا انتقال ۵ محرم ۶۶۴ھ کو ہوا ہے ۔۔۔ (خواجہ نظام الدین اولیاء) آخری بار رمضان ۶۶۳ھ میں اجودھن میں تھے۔ شوال (۶۶۳ھ) میں بابا صاحب نے آپ کو دہلی کے لیے رخصت کر دیا تھا اور اس کے تین ماہ بعد، محرم ۶۶۴ھ میں بابا صاحب نے رحلت فرمائی۔''

تاہم عین اسی صفحے کے زیریں حاشیے میں، پروفیسر نثار صاحب یہ بالکل متضاد بات بھی اپنے قلم سے لکھتے ہیں:

''اسی سفر میں، تیرہ رمضان ۶۶۹ھ کو، بابا صاحب نے (شیخ نظام الدین اولیاء کو) خلافت عطا فرمائی تھی (سیر الاولیاء۔ ۱۱۶)''

واضح رہے کہ پروفیسر صاحب نے یہاں بھی ''سیر الاولیاء'' کے اول الذکر مبینہ بیان پر جس میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ھ بتایا گیا ہے، قطعاً کسی ذہنی تحفظ کا اظہار نہیں کیا۔ دوسرے صفحات کو فی الحال چھوڑ کر، اگر اس وقت ماہنامہ 'منادی' کے صفحہ نمبر ۱۴۳ پر لکھی ہوئی مندرجہ بالا دونوں تحریروں کو آمنے سامنے رکھیں تو یہ عیاں ہے کہ ماہنامہ 'منادی' کے ایک ہی شمارے کے ایک ہی صفحے پر، بابا صاحب کے سالِ وصال کے حوالے سے دو ایسی ناممکن باتیں درج ہیں جو اس سے پہلے ماہنامہ منادی کے صفحات نمبر ۱۳، اور ۱۳۹ پر بھی لکھی جا چکی ہیں اور اب صفحہ نمبر ۱۴۳ پر دہرائی جا رہی ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی شمارے میں، صفحہ نمبر ۱۹۵ پر، پروفیسر نثار صاحب نے اپنے ایک اور مضمون میں (جس کا ذکر نیچے آئے گا) خلافت عطا ہونے کا واقعہ ۶۶۹ھ میں ہونا بھی غلط ٹھہرایا ہے اور اپنی اس قطعی رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ واقعہ ۶۶۰ھ میں ہوا، اور اسی قطعی رائے کا اظہار انہوں نے اسی مضمون میں دوبارہ صفحہ نمبر ۲۰۳ پر بھی کیا ہے (جس کا تذکرہ بھی نیچے آئے گا)۔ ہمیں افسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ ان کی قطعی رائے قطعی غلط تھی جس کا بالواسطہ اعتراف بھی، بعد میں، ان کے اپنے قلم سے ہوا۔ اگر یہ اعتراف بالواسطہ کی بجائے بلاواسطہ اور کھل کر کیا جاتا، تو بہتر ہوتا۔

(v) صفحہ نمبر ۱۴۵

اسی فاضلانہ مضمون میں 'تاریخی غلطیاں' کے ذیلی عنوان اور 'سیر الاولیاء' (کے صفحہ نمبر ۹۱) کا (غلط) حوالہ دیتے ہوئے، پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

''شیخ سعد الدین حمویہ نے ۶۵۵ھ میں انتقال کیا۔ اس کے تین سال بعد ۶۵۸ھ میں شیخ سیف الدین باخرزی کی وفات ہوئی اور ان سے تین

سال بعد ۶۶۱ھ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا وصال ہوا، اور ان سے تین سال بعد حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا ہے"۔ (حوالہ سیر الاولیاء۔ ۹۱)

اس حوالے سے ان کی مراد 'سیر الاولیاء' کا چرنجی لال اڈیشن ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ہمارے سامنے اس وقت 'سیر الاولیاء' کے چار فارسی نسخے اور ایک اردو ترجمہ ہے جن میں سے فارسی کا پہلا قلمی نسخہ ۱۰۱۳ھ مطابق ۱۶۰۵ء، اور دوسرا ۱۰۹۳ھ مطابق ۱۶۸۲ء میں کتابت ہوا، یہ اس وقت "سیر الاولیاء" کے قدیم ترین مصدقہ قلمی نسخے ہیں۔ فارسی کا تیسرا قلمی نسخہ جس پر سنہِ کتابت تحریر نہیں، کراچی کے قومی عجائب خانے میں ہے۔ فارسی کا چوتھا مطبوعہ نسخہ جو در حقیقت چرنجی لال کے دہلی ایڈیشن ۱۸۸۵ء کا طبعِ ثانی ہے، ۱۹۷۸ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ۲۰۰۴ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ ان سب کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان میں سے کسی ایک کتاب میں بھی مندرجہ بالا سنینِ دفات کا ذکر نہیں۔ صرف تین تین سال کے وقفے کا تذکرہ ہے۔ پروفیسر صاحب نے سنین کا اضافہ از خود کر ڈالا۔ کاش وہ یہ نہ کرتے!

(vi) صفحہ نمبر ۱۴۷

اسی مضمون میں، وہ آگے لکھتے ہیں:

"یہ واقعہ حضرت نظام الدین کے آخری سفرِ اجودھن (۶۶۳ھ) کا ہوگا اور بابا صاحبؒ کے انتقال کے بعد (۶۶۴ھ) ہی (؟) شمس الدین کو دبیر (اتالیق) کا عہدہ ملا ہے۔"

خواجہ نظام الدین اولیاء کو بابا صاحب کا خلافت نامہ، خواجہ صاحب کے

(باباصاحب کے دورانِ حیات) آخری سفرِ اجودھن میں عطا ہوا تھا۔ واضح رہے کہ صفحہ نمبر ۱۴۳ کے زیریں حاشیے میں، سیر الاولیاء کے حوالے سے، پروفیسر صاحب، کسی تبصرے، تحفظ یا تصحیح کے بغیر، یہ لکھ چکے ہیں کہ ''اسی سفر میں تیرہ رمضان ۶۶۹ھ کو، باباصاحب نے (شیخ نظام الدین اولیاء کو) خلافت عطا فرمائی تھی'' اور اس کے بعد، پروفیسر صاحب نے اس رائے کا بھی دوبار اظہار کیا تھا (جس کا ذکر صفحہ نمبر ۱۹۵ اور ۲۰۳ کے تحت آئے گا) کہ یہ سال ۶۶۹ء نہیں بلکہ ۶۶۰ء ہے اور اب صفحہ نمبر ۱۴۷ پر، وہ ۶۶۳ھ کو بھی خلافت نامہ عطا ہونے کے واقعہ کا سال قرار دے رہے ہیں۔ اس طرح پروفیسر صاحب کے مطابق بابا صاحب نے خواجہ صاحب کو خلافت نامہ، یکے بعد دیگرے، ۶۶۰ھ، ۶۶۳ھ اور ۶۶۹ھ میں عطا کیا۔

(vii) صفحہ نمبر ۱۸۱

''فوائد السالکین ...... ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے، ماہنامہ 'منادی' میں شائع ہونے والے، اپنے تیسرے مضمون میں، ''سوانحی بیانات'' کے ذیلی عنوان سے، پروفیسر صاحب نے، اپنے وسیع مطالعے اور علم کی بناپر، لکھا ہے:

''ہمیں معلوم ہے کہ باباصاحب نے ۶۶۴ھ میں نوے سال سے زائد (تقریباً ۹۳ سال) کی عمر میں انتقال فرمایا ہے۔''

''معلوم'' ہونے کی سند کے طور پر' پروفیسر نثار صاحب نے اسی صفحے کے زیریں حاشیے پر، دو کتابوں یعنی ''فوائد الفواد: ۸۹'' اور ''سیر الاولیاء: ۹۱'' کے حوالے دیئے ہیں۔ ۶۶۴ھ کی تائید یا توثیق میں، فوائد الفواد کا حوالہ اس وجہ سے درست نہیں کہ فوائد الفواد میں ایک مجلس کے علاوہ، کہیں بھی کوئی سنہ تحریر نہیں اور یہ واحد استثناء فوائد الفواد کی چوتھی جلد کی ۲۹ ویں مجلس ہے جو گیارہ جمادی الاولیٰ ۷۱۶ھ (مطابق یکم اگست ۱۳۱۶ء) بروز اتوار منعقد ہوئی۔ اس مجلس میں خواجہ نظام الدین اولیاء نے

ایک مصرعے کے حروف سے التمش کا سالِ وصال نکالا تھا۔ سیر الاولیاء کے صفحہ نمبر ۹۱ کے بارے میں ہمارا تبصرہ پہلے ہی سے نمبر شمار (v) پر موجود ہے۔ پروفیسر صاحب نے فوائد الفواد اور سیر الاولیاء دونوں کے غلط حوالے دیئے ہیں۔

(viii) صفحہ نمبر ۱۹۵

''درر نظامیہ ..... حضرت بابا فرید اور حضرت محبوبِ الٰہی کے حالات کا ایک ماخذ'' کے عنوان سے، اپنے چوتھے مضمون میں، پروفیسر نثار صاحب لکھتے ہیں:

> ''درر نظامیہ سے، حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک سفرِ اجودھن کی تاریخ قطعیت سے معلوم ہوجاتی ہے۔ آپ ۲۶ رمضان ۶۶۰ ھ کو باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اسی سال آپ کو خلافت نامہ عطا ہوا تھا۔ (درر نظامیہ۔ ۱۲۶)''

اسی صفحے کے زیریں حاشیے میں، پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

> ''سیر الاولیاء میں بعض سنہ (سنین) صریحاً غلط ہیں۔ ان پر تفصیل سے بحث علیحدہ مضمون میں کی گئی ہے۔ اس موقع پر بھی سیر الاولیاء میں ۶۶۹ ھ درج ہے حالاں کہ ۶۶۴ ھ میں باباصاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔''

ہماری نظر سے پروفیسر صاحب کا وہ علیحدہ تحقیقی مضمون نہیں گزرا، جو یقیناً چھپ چکا ہوگا، جس میں انہوں نے سیر الاولیاء میں درج شدہ صریحاً غلط سنین پر تفصیل سے بحث کی ہوگی۔ یہاں غور کرنے والی بات صرف اتنی ہے کہ کم از کم ستمبر ۱۹۷۴ء تک پروفیسر نثار صاحب کی یہ بہت پختہ رائے تھی، جس کا انہوں نے بار بار برملا اظہار کیا، کہ باباصاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ ھ ہے اور سیر الاولیاء میں ایک بار نہیں بلکہ تین بار دیا ہوا سنہ ۶۶۹ ھ جس میں باباصاحب کو ۶۶۹ ھ میں زندہ بتایا گیا ہے، انہوں نے غلط قرار دیا۔

درر نظامیہ کے مصنف مولانا علی بن محمود جاندار ہیں۔ پروفیسر نثار صاحب نے

ماہنامہ منادی دہلی (ستمبر ۱۹۷۴ء) کے صفحہ نمبر ۱۹۰ پر لکھا ہے کہ اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں بتایا جاتا ہے اور اس کا فارسی متن ابھی تک (ستمبر ۱۹۷۴ء تک) غیر مطبوعہ ہے۔ صرف اردو ترجمہ دلی سے شائع ہوا ہے جس کا سنِ اشاعت نہیں دیا گیا۔ ہمارے نزدیک تاریخ کے اہم امور پر قطعی رائے قائم کرنے کے لیے، صرف اردو ترجمے پر کلی انحصار کر لینا محتاط عمل نہیں ہے اور ایک معلم، مؤرخ اور محقق کے لیے تو قطعاً محتاط عمل نہیں ہے جسے اس کی تصدیق کے لیے دلی سے کول کتے جانا چاہیئے تھا جو ایک ہی ملک میں واقع ہیں۔

(ix) اسی صفحے (صفحہ نمبر ۱۹۵) پر لکھا ہے:

"بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بابا صاحب کے برادرِ خورد حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کا انتقال بابا صاحب کے وصال سے "چند ماہ قبل" ہوا تھا مگر درر نظامیہ سے حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے انتقال کی تاریخ معلوم ہو جاتی ہے کہ انہوں نے نو رمضان ۶۶۰ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا تھا جب کہ بابا صاحب پانچ محرم ۶۶۴ھ کو محبوبِ حقیقی سے واصل ہوئے ہیں۔"

(x) اسی صفحے (صفحہ نمبر ۱۹۵) پر آگے یہ فقرہ آتا ہے:

"ہمیں معلوم ہے کہ انہوں نے (بابا صاحب نے) ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا ہے۔"

گویا پروفیسر صاحب کی رائے میں (جو ایک ہی صفحہ نمبر ۱۹۵ پر درج ہے) ۶۶۰ھ میں بابا صاحب نے خواجہ صاحب کو خلافت نامہ عطا کیا اور اس کے کئی برس بعد ۶۶۴ھ میں بابا صاحب کا انتقال ہوا۔ افسوس کہ تاریخ کے حقائق یکسر مختلف ہیں۔ خلافت نامہ عطا کرنے کے بعد چار ماہ سے کم عرصے میں بابا صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔

(xi) صفحہ نمبر ۲۰۳

اسی (چوتھے) مضمون میں یہ لکھا گیا ہے:

"(خواجہ نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ) میں نے یہ دعا یاد کر لی اور شہر میں روز پڑھتا رہا۔ پھر چھبیسویں ماہ رمضان ۶۶۰ ھ میں جو حاضر خدمت ہوا تو فرمایا..... کہ تم ایسے درخت بنو گے کہ تمہارے سائے میں خلقِ خدا آرام کرے گی ۔۔۔۔۔۔۔۔ بعد ازاں مولانا بدر الدین اسحٰق سے ارشاد کیا کہ کاغذ لا کر اجازت نامہ لکھ دو۔ انہوں نے اجازت نامہ تیار کیا۔ حضور نے اپنا دستِ خاص سے اجازت نامہ اور خلعت مجھے عنایت فرما کر ارشاد کیا کہ ہانسی میں مولانا جمال الدین اور دہلی میں قاضی منتجب الدین کو دکھا دینا۔"

اگر صفحات نمبر ۱۹۵ اور ۲۰۳ پر درج شدہ مندرجہ بالا غلط بیانات کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے یہ غلط نتیجہ نکلے گا کہ بابا صاحب نے اپنے انتقال سے تین برس پہلے خواجہ نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ عطا فرمایا۔

(xii) اسی صفحے (صفحہ نمبر ۲۰۳) کے زیریں حاشیے میں، پروفیسر صاحب پھر یہ لکھتے ہیں:

"سیر الاولیاء: ۱۱۶" میں خلافت ملنے کی تاریخ تیرہ رمضان ۶۶۹ ھ ملتی ہے لیکن یہ غلط ہے اور درر نظامیہ کی روایت یعنی ۶۶۰ ھ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ تفصیلی بحث دوسرے موقع پر ہو گی۔"

شاید یہ دوسرا موقع بھی آیا ہو جس میں پروفیسر صاحب نے سیر الاولیاء کی (درست) روایت کو غلط اور درر نظامیہ کی (غلط) روایت کو درست ثابت کیا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہو تو وہ تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری۔ تاہم ماہنامہ منادی میں یہ سات مضامین لکھنے

کے چودہ برس بعد، فروری ۱۹۸۹ء میں، جب پروفیسر نثار صاحب نے ماہنامہ منادی کے مالک اور مدیر خواجہ حسن نظامی ثانی دہلوی کے ''فوائد الفواد'' کے اردو ترجمے پر ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی، عالمانہ اور محققانہ مقدمہ لکھا تو اس کے صفحہ نمبر ۱۱۰ پر لکھا:

''حضرت بابا صاحب کا انتقال پانچ محرم ۶۷۰ھ/ تیرہ اگست ۱۲۷۱ء کو ہوا۔''

دس برس بعد، ۱۹۹۹ء میں، کراچی کے رسالے جہانِ چشت کے اکتوبر ۱۹۹۹ء کے شمارے کے صفحہ نمبر ۴۲ پر، پروفیسر صاحب نے پھر یہ لکھا:

''بابا صاحب کا وصال پانچ محرم ۶۷۰ھ کو ہوا اور اس وقت ان کی عمر نوے سال کی تھی۔''

اس کے مزید چار برس بعد، ۲۰۰۳ء میں، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، بھارت کے جریدے ''معارف'' کے جولائی ۲۰۰۳ء کے شمارے کے صفحہ نمبر ۶۵ پر، پروفیسر صاحب نے پھر یہ لکھا:

''حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر (وفات: ۵ محرم ۶۷۰ھ)''

اگر پروفیسر نثار صاحب ستمبر ۱۹۷۴ء میں، دوبار، یہ نہ لکھتے کہ ''ہمیں معلوم ہے'' کہ بابا صاحب کا وصال ۶۶۴ھ میں ہوا تو بہت اچھا کرتے۔ علم بعض اوقات حجابِ اکبر بن جاتا ہے۔ یہ قول فوائد الفواد میں ہی درج ہے اور پروفیسر صاحب نے ۱۱۲ صفحات پر محیط اپنے محولہ بالا عالمانہ اور محققانہ مقدمے کے صفحہ نمبر ۱۰۰ پر، اس قول کو خود نقل کیا ہے اور جس پسِ منظر میں کیا ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(III) مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم

مولانا مرحوم گو فریدی ہیں لیکن ان کا تعلق بابا صاحب کے خانوادے سے نہیں بلکہ مٹھن کوٹ ضلع ڈیرہ غازی خان کے خواجہ غلام فرید کی نسبت سے ہے۔ مولانا صاحب کا تعلق سرائیکی علاقے اور پنجاب کے محکمہ تعلیم سے تھا۔ وہ متعدد تاریخی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ایک کتاب مشائخِ چشت ہے جو قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان نے شائع کی۔ کتاب پر اس کا سالِ تصنیف یا سنہِ اشاعت درج نہیں۔ صفحہ نمبر ۱۶۷ پر لکھا ہے:

"نو اکتوبر ۶۶۴ھ بمطابق پندرہ اکتوبر ۱۲۶۵ء حضرت شیخ العالم (بابا صاحب) نے جان بحق تسلیم کی۔"

پہلی بدیہی غلطی تو یہی ہے کہ ہجری کیلنڈر میں اکتوبر کا مہینا نہیں ہوتا۔ دوسری بدیہی غلطی یہ ہے کہ 'پانچ' (محرم) کی بجائے 'نو' لکھ دیا گیا ہے۔ سرائیکی علاقے کے ایک ممتاز معلم اور مؤرخ ہونے کے ناطے، مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم سے یہ توقع بے جا نہ تھی کہ مشائخِ چشت پر ان کی محققانہ تاریخ میں بابا صاحب کی تاریخِ وفات کے بارے میں یہ دو بدیہی غلطیاں نہ نکلتیں بلکہ ان سے تو بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر وہ بابا صاحب کے صحیح سالِ وصال کے تعین کے لیے وقت نہیں نکال سکتے تھے تو کم از کم اپنی کتاب میں بابا صاحب کے درج شدہ سالِ وصال، یعنی ۶۶۴ھ، کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کر دیتے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہاں بھی یہ وضاحت کر دی جائے کہ مولانا مرحوم کی کتاب کا موضوع مشائخِ چشت کی تاریخ تھا، بابا صاحب کی سوانحِ حیات (جو پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی کتاب کا موضوع تھا) یا بابا صاحب کا سالِ وصال نہیں (جسے پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے اپنی خصوصی توجہ اور تحقیق کا مرکز بنایا)۔

(IV) شیخ محمد اکرام مرحوم

شیخ صاحب مرحوم اس مرحوم سروس کے رکن تھے جو انگریزی دورِ حکومت میں 'انڈین سول سروس' یا مختصراً "I.C.S." کہلاتی تھی۔ تاہم ان کے مرنے کے بعد ان کا نام زندہ ہے تو وہ ''آئی سی ایس'' افسر ہونے کے ناطے نہیں جو ہزاروں ہوئے اور گزر گئے، اور جن کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا، بلکہ اپنی تین شاہکار تصانیف یعنی آبِ کوثر، رودِ کوثر اور موجِ کوثر کے حوالے سے ہے۔ اپنی اولیں تصنیف آبِ کوثر میں شیخ صاحب مرحوم نے برِ صغیر پاک و ہند کے علماء، فقہاء اور صوفیہ کی تاریخ، اس برِ صغیر میں اسلام کی آمد سے خاندانِ لودھی تک قلم بند کی ہے۔ کتاب ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی اور ہمارے سامنے اس کا سولھواں اڈیشن ہے جو ادارہِ ثقافتِ اسلامیہ نے، ۱۹۹۴ء میں، لاہور سے شائع کیا۔ اس کے صفحہ نمبر ۲۱۸ پر درج ہے:

''اپنی وفات یعنی ۱۲۶۵ء تک (بابا فرید) وہیں (یعنی پاک پتن میں) رہے۔''

انصاف کا تقاضا ہے کہ یہاں بھی اس امر کا ذکر ہو جائے کہ جب ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ، شیخ محمد اکرام مرحوم یہ عالمانہ اور محققانہ کتاب لکھ رہے تھے تو ان کا مقصد اسلام کے ان عظیم سرداروں کی پیدائش یا وفات کی تواریخ کا تعین نہ تھا۔ اگر شیخ صاحب مرحوم نے آبِ کوثر میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۱۲۶۵ء لکھا جو قمری تقویم کے مطابق ۶۶۴ھ بنتا ہے اور آبِ کوثر کے بعد میں آنے والے اڈیشنوں میں بھی یہی سنہ تواتر سے چھپتا رہا تو انہوں نے یہ سنہ کسی سند کی بنیاد پر لکھا ہوگا اور یہ سند وہ کتاب یا کتابیں ہوں گی جو ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ شیخ صاحب مرحوم کے سامنے ہوں گی۔ اس بنا پر شیخ صاحب مرحوم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر اس مستند کتاب، یا ان مستند کتب میں، بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۵ء لکھا ہے تو اسے

بادی النظر میں درست تسلیم کر لینا چاہیے اور پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ان کی کتاب کا موضوع باباصاحب نہیں تھے بلکہ برِ صغیر پاک و ہند کے جملہ ممتاز علماء، فقہاء اور صوفیہ تھے۔

(V) سید افضل حیدر

سید افضل حیدر سابق صوبائی وزیرِ قانون، اور اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق رکن ہونے کے علاوہ، باباصاحب کے سچے عقیدت مند ہیں اور باباصاحب پر لکھی جانے والی اپنی کتابوں کو اپنی ''زندگی کا سب سے اہم تخلیقی اور تحقیقی کارنامہ'' سمجھتے ہیں۔ غالباً شیخ محمد اکرام کا اتباع کرتے ہوئے، انہوں نے اپنی کتاب ''زندگی نامہ بابافرید گنج شکر'' میں، جو ۲۰۰۲ء میں دوست پبلی کیشنز اسلام آباد نے شائع کی، باباصاحب کی وفات کا ذکر صرف ایک جملے میں کر دیا ہے۔ صفحہ نمبر ۸۳ پر تحریر ہے:

''۱۲۶۵ء آپ (باباصاحب) کا سِن (سنہ) وفات بتایا جاتا ہے۔''

۱۲۶۵ء، ۶۶۴ھ سے مطابقت رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ دسمبر ۲۰۰۱ء، جنوری ۲۰۰۲ء اور مارچ ۲۰۰۲ء میں راقمِ حروف کا ایک مضمون ''فرید الدین گنج شکر کا سالِ وفات'' برِ صغیر پاک و ہند کے قدیم اور معروف علمی مجلّے ''معارف'' میں تین اقساط میں شائع ہو چکا تھا جس میں تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ۱۲۶۵ء (مطابق ۶۶۴ھ) باباصاحب کا سالِ وصال نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۰۲ء میں، اس کتاب کی اشاعت کے وقت، مندرجہ بالا مضمون فاضل مصنف کی نظر سے نہیں گزرا۔

(VI) سید نصیر احمد جامعی

سید صاحب کی کتاب کا نام 'حضرت بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ' ہے جو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔ کتاب پر سالِ تصنیف یا سنہِ اشاعت درج نہیں۔ صفحہ نمبر ۱۶۷ پر لکھا ہے:

''نو محرم ۶۶۴ھ مطابق پندرہ اکتوبر ۱۲۶۵ء، بابا صاحب (نے) ....جان بحق تسلیم کی۔''

مندرجہ بالا فقرے میں، لفظ ''نو'' پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ مصنف یا کاتب کا سہو قلم ہے جو پروف پڑھتے وقت درست نہیں ہوا۔ جب کتاب میں صدیوں سے متفقہ تاریخِ وفات (۵ محرم) کے اندراج میں یہ سہو ہوسکتا ہے تو ظاہر ہے کہ (غیر متفقہ) سالِ وصال کے بارے میں لکھتے وقت کسی تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہوگا یا اس کی صحتِ اندراج کو کسی خصوصی اہمیت کا حامل نہیں سمجھا گیا ہوگا۔

(VII) سید مسلم نظامی دہلوی

سید صاحب کا تعلق بابا صاحب کے خانوادے سے ہے۔ تقسیمِ ہند سے قبل، وہ دلّی میں بستی نظام الدین کے باسی تھے جہاں آج بابا صاحب کے محبوب ترین خلیفہ محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء محوِ خواب ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد، وہ بابا صاحب کی خواب گاہ کی بستی پاک پتن میں بس گئے۔ سید صاحب نے 'انوار الفرید المعروف بہ تاریخِ فریدی' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو صوفیہ دار الاشاعت، بیت الفرید، اردو منزل، پاک پتن نے ایک سے زائد بار شائع کی۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے، اس پر کتاب کا سالِ تصنیف یا سنہِ اشاعت درج نہیں۔ صرف طبع ہفتم درج ہے۔ صفحہ نمبر ۴۴ پر لکھا ہے:

''حضرت بابا صاحب کے (سنہ) سنِ وفات ۶۶۴ھ پر سیرت نگاروں کی
اکثریت ہے۔''

دوسرے سوانح نگاروں سے ہٹ کر، جنہوں نے ۶۶۴ھ یا ۱۲۶۵ء کو، کسی تبصرے یا ذہنی تحفظ کے بغیر، بابا صاحب کے سالِ وصال کے طور پر درج کیا ہے، سید مسلم نظامی دہلوی نے ''اکثریت'' کا لفظ استعمال کر کے اپنے تحفظات کا اظہار کر دیا ہے۔

(VIII) سید صباح الدین عبدالرحمٰن

سید صاحب نے، ۱۹۵۰ء میں بزمِ صوفیہ کے نام سے جو کتاب لکھی، اس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے جو ۱۹۷۱ء میں، مطبع معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، بھارت سے شائع ہوا۔ صفحہ نمبر ۱۷۴ پر لکھا ہے:

''گزشتہ اوراق میں ذکر آیا ہے کہ سیر الاولیاء، اخبار الاخیار، جواہرِ فریدی اور سفینۃ الاولیاء میں تاریخِ وفات ۵ محرم روز سہ شنبہ (منگل) ۶۶۴ ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔''

(IX) شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ مجدد الف ثانی اور ابوالفضل کے ہم عصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی مشہور کتاب اخبار الاخیار کا نقشِ اول آج سے کوئی چار صدی پہلے مرتب کیا، گویا یہ بات گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور کی ہے۔ مرآۃ الاسرار کے مصنف شیخ عبدالرحمٰن چشتی (جن کا ذکر آگے آئے گا) کا تعلق بھی اسی صدی سے ہے اور اس طرح وہ ان متذکرہ بالا تین اصحاب کے ہم عصرِ خورد ہیں۔ (چند سطور بعد جو

جدول دی گئی ہے، اس سے یہ بات مزید واضح ہوجائے گی) مطبع مجتبائی دہلی نے ، ۱۹۱۴ء (مطابق ۱۳۳۲ھ) میں، اخبار الاخیار فی اسرار الابرار کے نام سے اس کتاب کا فارسی زبان کا نسخہ شائع کیا جس کے صفحہ نمبر ۵۴ پر بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں یہ اندراج ہے:

"وفاتِ او پنجم ماہِ محرم ۶۶۴ ہجری اربع وستین وستمائۃ وعمرِ شریفش نو د و پنج سال۔"

ہمارے سامنے اخبار الاخیار کے جو دو اردو تراجم ہیں، ان دونوں کے مابین بابا صاحب کے سنہِ وصال میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تفصیلات یہ ہیں:

(i) اخبار الاخیار کے پہلے اردو ترجمے کا نام: انوارِ صوفیہ

مترجم: محمد لطیف ملک — سالِ اشاعت: پہلا اڈیشن: ۱۹۵۸ء

ناشر: شعاعِ ادب، لاہور — دوسرا اڈیشن: ۱۹۶۲ء

پہلے ترجمے کے دوسرے اڈیشن (۱۹۶۲ء) کے صفحہ نمبر ۱۱۱ پر تحریر ہے:

"حضرت بابا فرید گنج شکر پانچویں محرم ۶۶۴ھ میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ عمر شریف ۹۵ سال کی تھی۔"

(ii) دوسرے اردو ترجمے کا نام: اخبار الاخیار

مترجم: اقبال الدین احمد — سالِ شاعت: ۱۹۹۷ء

ناشر: دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی

دوسرے ترجمے کے صفحہ نمبر ۸۶ پر یہ عجیب وغریب تحریر درج ہے:

"بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنی عمر کے (۵۹) سال پورے کر کے ۵ محرم ۶۶۸ھ میں وفات پائی۔"

اس اشاعتی ادارے کا تعلق ایک جانے پہچانے مذہبی خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ راقمِ حروف نے ذاتی طور پر "دارالاشاعت" کراچی جا کر اس (عجیب و غریب) تحریر کے ماخذ اور مترجم کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیں لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی جس پر صرف اظہارِ افسوس کیا جا سکتا ہے۔

بالائی سطور میں جس جدول کا ذکر کیا گیا تھا، وہ درج ذیل ہے:

جدول

نمبر شمار	نام	پیدائش		وصال		عمر
		ہجری سنہ	عیسوی سنہ	ہجری سنہ	عیسوی سنہ	عیسوی تقویم
۱	شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۹۵۸ھ	۱۵۵۱ء	۱۰۵۲ھ	۱۶۴۲ء	۹۱ برس
۲	ابوالفضل	۹۵۸ھ	۱۵۵۱ء	۱۰۱۱ھ	۱۶۰۲ء	۵۱ برس
۳	شیخ مجدد الف ثانی	۹۷۱ھ	۱۵۶۳ء	۱۰۳۴ھ	۱۶۲۴ء	۶۱ برس
۴	شیخ عبدالرحمٰن چشتی	۱۰۰۵ھ	۱۵۹۶ء	۱۰۹۴ھ	۱۶۸۲ء	۸۶ برس

(x) دارا شکوہ

مغل بادشاہ شاہ جہاں کے سب سے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے مترجم محمد علی لطفی اور ناشر نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ،

کراچی ہیں۔ ہمارے سامنے اس کا پانچواں اڈیشن ہے جس کا سنہِ اشاعت ۱۹۷۵ء ہے۔ داراشکوہ، ۴۳ برس کی عمر میں، ۱۶۵۸ء (مطابق ۱۰۶۸ھ) میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح یہ کتاب سترھویں صدی عیسوی (مطابق گیارھویں صدی ہجری) کے وسط سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو ترجمے کے صفحہ نمبر ۱۳۳ پر تحریر ہے:

"آپ (باباصاحب) کی وفات سہ شنبہ (منگل) ۵ محرم ۶۶۴ھ کو ہوئی۔"

واضح رہے کہ ۵ محرم ۶۶۴ھ ہفتے کا دن تھا، منگل نہیں۔

(xi) مولانا محمد علی اصغر چشتی

مولانا چشتی کی کتاب کا نام جواہرِ فریدی ہے۔ یہ کتاب شہنشاہ جہانگیر کے عہد کے آخری حصے میں لکھی گئی۔ سنہِ تصنیف ۱۰۳۳ھ (مطابق ۲۴-۱۶۲۳ء) ہے، یعنی یہ کتاب سترھویں صدی عیسوی (مطابق گیارھویں صدی ہجری) کے پہلے نصف حصے سے تعلق رکھتی ہے۔ (واضح رہے کہ ۱۰۱۳ھ (مطابق ۱۶۰۵ء) کا "سیرالاولیاء" کا قلمی نسخہ آج کول کتے میں موجود ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔) کتاب کا اردو ترجمہ ملک فضل الدین نقشبندی نے کیا ہے اور ناشر اللہ والے کی قومی دکان کشمیری بازار لاہور ہیں۔ ترجمے پر سالِ اشاعت درج نہیں، تاہم اس کے آخری صفحے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ غالباً ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ صفحہ نمبر ۳۲۵ پر تحریر ہے:

"وفات شریف حضرت کی ۶۶۴ھ میں واقع ہے۔ پانچویں محرم روز سہ شنبہ (منگل) چنانچہ بعض نے غرّہ تاریخ لکھی ہے:

"(۱) فریدِ عصری (۲) اولیائے خدا"

پانچویں محرم کے ذکر کے بعد، آخری فقرے یعنی غرّہ تاریخ کا مطلب واضح نہیں۔ اس ترجمے کے صفحہ نمبر ۴۵۵ پر جو جواہرِ فریدی کے ترجمے کا حصہ نہیں بلکہ مترجم کی

اپنی جانب سے (مقدمے کے طور پر) شامل کیا گیا ہے، یہ تحریر ہے:

''وفات شریف آپ کی عہد سلطان غیاث الدین بلبن اناء اللہ

برہانہ، میں بروز سہ شنبہ پنجم ماہ محرم الحرام ۶۶۶ھ میں واقع ہوئی۔''

واضح رہے کہ ۵ محرم ۶۶۶ھ کو پیر کا دن تھا۔ منگل (سہ شنبہ) نہیں۔ ثانیاً

۶۶۶ھ کا ذکر لا کر مترجم نے کتاب میں دیئے ہوئے سنہ وفات یعنی ۶۶۴ھ کی تردید

کردی لیکن تردید کی وجہ بیان نہیں کی۔

(XII) سیر الاولیاء

سوال یہ ہے کہ ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کے سنِ وصال ہونے کی روایت کا آغاز کہاں سے ہوا۔ یہی وہ پہلا سوال ہے جو اس کتاب کے آغاز میں کیا گیا تھا۔ یہ روایت ''سیر الاولیاء'' سے منسوب کی جاتی ہے جو سید محمد بن نور الدین مبارک بن محمد کرمانی کی تالیف ہے۔ سید محمد کرمانی خواجہ نظام الدین اولیاء کے انتہائی عقیدت مند مرید تھے اور ''امیر خورد کرمانی'' کے لقب سے اس لیے مشہور ہوئے کہ ان کے نامور ہم نام دادا سید محمد کرمانی بابا صاحب کے انتہائی عقیدت مند مرید تھے۔ گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ امیر خورد کرمانی کا سنِ وفات ۷۷۰ھ (مطابق ۶۹۔۱۳۶۸ء) بتایا جاتا ہے، یعنی بابا صاحب کے سنِ وفات سے کوئی سو سال بعد۔ اس طرح ''سیر الاولیاء'' اب سے کوئی ساڑھے چھ صدی پہلے، فیروز شاہ تغلق کے عہد کے وسط میں، آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی۔ اسی دور میں، اور ''سیر الاولیاء'' کے آغاز تالیف سے ایک دو برس قبل، ضیاء الدین برنی کی مشہور ''تاریخ فیروز شاہی''، مکمل ہوئی جس کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔ مشائخِ چشت کی حیات، سیرت اور ملفوظات پر ''سیر الاولیاء'' سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کا اصل نسخہ تو ظاہر ہے کہ ناپید ہے لیکن

اس کی شہرت کی وجہ سے ، خدا جانے ، اس کی کتنی نقول درنقول ، بیتی صدیوں میں، کتابت ہوئیں۔

''سیرالاولیاء'' کا قدیم ترین مصدقہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی ، کول کتا، بھارت کے میوزیم میں ہے جس کی کتابت کی تکمیل ویسے تو ۲۰ رمضان ۱۰۱۳ھ (مطابق ۳۰ جنوری ۱۶۰۵ء) کو ہوگئی تھی لیکن اس کی تکمیل کے بعد جب نعمت اللہ نوری نامی کسی بزرگ کو خیال آیا کہ اس مخطوطے میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے نانا اور دادا کے علاوہ ''سیرالاولیاء'' کے مؤلف امیر خورد کا شجرہ نسب نہیں دیا گیا، تو انہوں نے اپنی دانست میں یہ کمی پوری کرنے کے لیے، اپنی طرف سے، مسودے میں تقریباً ڈھائی صفحات کا اضافہ کروا ڈالا۔ اس اضافے کے اختتام پر، مخطوطے کے آخر میں، اس کی تاریخ کتابت ۴ جمادی الاولیٰ ۱۰۴۰ھ (مطابق ۲۹ نومبر ۱۶۳۰ء) درج ہے اور حوالے کی کتابوں میں مؤخر الذکر قمری تاریخ کا ہی ذکر ملتا ہے۔

یہ قلمی نسخہ چار سو برس پرانا ہے اور عہدِ اکبری کے آخری سال (۱۶۰۵ء) میں قلم بند کیا گیا۔ مخطوطے کے شروع کے بہت سے اوراق غائب ہیں اور اس کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے:

''بترس از دوستی کہ حاجیاں را چوں کافرانِ روم می کشند و با حاجیاں غزا مے کنند''

مندرجہ بالا فقرہ چرنجی لال اڈیشن (۱۹۷۸ء) کے صفحہ نمبر ۴۷ کی آخری سطر ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کول کتے کے مخطوطے کے کتنے اوراق غائب ہیں۔ موجودہ حالت میں اس نامکمل اور اضافہ شدہ مخطوطے کے ۳۵۹/ اوراق ہیں جو ۷۱۷ صفحات بنتے ہیں۔ یہ پہلے فورٹ ولیم کالج کول کتا کی لائبریری میں تھا اور اب ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا کے میوزیم میں، ''Persian Society Collection-243'' کی درجہ بندی کے تحت محفوظ ہے۔

''سیر الاولیاء'' کا دوسرا قدیم ترین مصدقہ قلمی نسخہ برٹش لائبریری لندن میں ہے جس کی کتابت دس شوال ۱۰۹۳ھ (مطابق دو اکتوبر ۱۶۸۲ء) کو مکمل ہوئی، یعنی یہ سوا تین سو برس پرانا ہے اور عہدِ اورنگ زیب عالم گیر (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) کے وسط میں لکھا گیا۔ اس کے ۳۰۲/ اوراق ہیں جو کل ۶۰۳ صفحات بنتے ہیں۔ یہ مخطوطہ پہلے انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں تھا۔ ۱۹۹۸ء میں جب نو تعمیر شدہ برٹش لائبریری کی عمارت لندن میں مکمل ہوئی تو یہ مخطوطہ اس جدید لائبریری (کی چوتھی منزل) میں منتقل کر دیا گیا، اور وہاں ''Delhi Persian 668 as in C. A. Storey'' کی درجہ بندی کے تحت محفوظ ہے۔ اس مخطوطے کے متن کا آخری فقرہ، صفحہ نمبر ۶۰۳ پر یہ ہے:

''نفس آں بادشاہ زادہ درکار شد''

''سیر الاولیاء'' کا ایک قلمی نسخہ کراچی کے قومی عجائب خانے میں بھی ہے جس پر اس کا سنہِ کتابت لکھا ہے نہ ہی کاتب کا نام یا اوراق (یا صفحات) کے نمبر درج ہیں۔ اس نسخے کے صفحات کی کل تعداد ۶۷۲ ہے یعنی برٹش لائبریری لندن کے قلمی نسخے سے ۶۹ صفحات زیادہ۔ ان ۶۹ صفحات میں سے آخری ''تقریباً'' ۱۳ صفحات (مفروضہ صفحات ۶۶۰ تا ۶۷۲) کا متن جو برٹش لائبریری کے مخطوطے کے مندرجہ بالا فقرے ''نفس آں بادشاہزادہ درکار شد'' کے بعد کی تحریر ہے، برٹش لائبریری لندن کے قلمی نسخے میں نہیں ہے اور ان ۱۳ صفحات کا اضافہ کراچی کے قومی عجائب خانے کے مخطوطے میں بعد میں کیا گیا ہے۔ اس مخطوطے کے متن کا آخری فقرہ صفحہ نمبر ۶۷۲ پر، یہ ہے:

''بہ ضرورت بر تختِ سلطنت جلوس فرمود و مردم از محنت و اندوہ آسودہ گردانید۔''

برِصغیر پاک و ہند میں، بابا صاحب کے تمام سوانح نگاروں نے، اپنی بیسویں صدی عیسوی کی تحریروں میں، سیر الاولیاء کے جس نسخے کے حوالے دیئے ہیں، وہ ''چرنجی لال اڈیشن'' کہلاتا ہے۔ اس قلمی نسخے کا سالِ کتابت نامعلوم اور قدامت غیر متعین

ہے۔ اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹/ اپر مال، لاہور کے سیر الاولیاء کے اردو ترجمے مطبوعہ ۲۰۰۴ء میں، ''سیر الاولیاء کی تاریخی سرگزشت'' کے عنوان کے تحت، چرنجی لال اڈیشن کے بارے میں ایک دلچسپ معلوماتی نوٹ لکھا ہے جس کے چند اقتباسات نیچے درج کیے جا رہے ہیں:

''۱۱۵۰ھ (مطابق ۱۷۳۷ء)، ''سیر الاولیاء'' (فارسی) کا ایک مخطوطہ سید عبداللہ.........کو ملا جو سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین اولیاء) کی اولاد (؟) میں سے تھے .... یہ نسخہ ان.... سے گم ہوگیا۔ ایک مدت کے بعد اتفاق سے بازار سے سید عبداللہ کو (سیر الاولیاء) کا ایک اور مخطوطہ ملا........لیکن یہ خطی نسخہ خاصا بدخط تھا اور اس کے الفاظ اور عبارت کو سمجھنے کے لیے نہایت غور وفکر کرنا پڑتا تھا۔

''سید عبداللہ نے اس نسخے کو شیخ نور محمد سے صاف کرایا۔ شیخ نور محمد خوش نویس بھی تھے اور فارسی نظم ونثر پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ پھر انہوں صرف ونحو کی تحصیل خاص طور پر کی تھی۔ گویا وہ اس نسخے کو صاف کرنے کے لیے موزوں ترین انسان تھے۔

''کچھ دن کے بعد، حبیب اللہ نامی ایک بزرگ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سید عبداللہ کا نسخہ، جسے شیخ نور محمد نے صاف کیا تھا، عاریتاً انہیں مل جائے، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ انہیں (حبیب اللہ کو) بھی بازار سے ایک مخطوطہ، جو غلطیوں سے پُر اور نہایت بدخط تھا، ہاتھ لگا۔ ایک مرتبہ اتفاق سے حبیب اللہ کی ملاقات سید عبداللہ سے ہوئی تو اس مخطوطے کا تذکرہ ہوا اور دونوں اصحاب نے طے کیا کہ ان مخطوطوں کی تصحیح و مقابلہ کیا جائے، چنانچہ.........مختلف شہروں سے اس کے نو نسخے جمع کیے گئے (اور) ان میں سے دو نسخوں کو تیار کیا گیا۔

''۱۲۱۷ھ (مطابق ۱۸۰۲ء) میں، شیخ بدر الاسلام فخری نظامی نے (اسے)......(شیخ) نور محمد کے لکھے ہوئے نسخے سے نقل کیا۔ شیخ بدر الاسلام کا بیان

ہے کہ (شیخ) نور محمد کا نسخہ اگرچہ (انہوں نے) کمال صحت کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن پھر بھی اصل نسخے میں جو اَسقام تھے......... ان کو اسی طرح نقل کر دیا ہے لیکن بعض جگہ ادب سے متجاوز ہو کر ان کو درست کیا ہے.......

''شیخ بدر الاسلام فخری نظامی کا یہ مخطوطہ جو......... شیخ نور محمد کاتب کے مخطوطے کی نقل ہے، ملکہ وکٹوریہ کے عہد ۴۷ جلوس (۱۸۸۴ء میں) منشی چرنجی لال آنجہانی کو سید شاہ ظہور علی سے جو درگاہ موصوف (خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ) کے قاضی زادوں میں تھے، دستیاب ہوا..... ''سیر الاولیاء'' کا مخطوطہ، جو منشی چرنجی لال کے ہاتھ لگا، وہ مولانا شیخ فخر الدین نظامی چشتی کے دستخط سے مزین تھا۔ اس مخطوطے کی طباعت کی تکمیل آٹھ ماہ میں ہوئی۔ سنہِ تکمیل ۱۳۰۲ھ (مطابق ۱۸۸۵ء) ہے۔

'' آخر میں، مَیں (مترجم) یہ ضرور عرض کروں گا کہ چرنجی لال کے اس مطبوعہ فارسی نسخے میں جو عبارات، بالخصوص عربی عبارات ہیں، وہ بیشتر غلطیوں سے پُر ہیں۔ یوں تو فارسی عبارات بھی غلطیوں سے مبرا نہیں لیکن ان کی تعداد عربی عبارات کے اسقام کے مقابلے میں کم ہے۔''

۱۹۷۲ء میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر اور محقق محمد حبیب مرحوم نے اپنی کتاب '' حضرت نظام الدین اولیاء حیات اور تعلیمات '' کے صفحہ نمبر ۱۴ پر ''سیر الاولیاء'' (چرنجی لال اڈیشن) کے بارے میں یہ تحریر کیا:

''سیر الاولیاء کے فارسی نسخے کو شعبان ۱۳۰۲ھ (مطابق مئی ۱۸۸۵ء) میں، لالہ چرنجی لال مالک و مہتمم مطبع محبِ ہند فیض بازار دہلی نے شائع کیا۔ اب (یعنی ۱۹۷۲ء میں) یہ چھپی ہوئی کتاب کہیں نہیں ملتی اور اس کا کاغذ بھی اس قدر خراب ہو گیا ہے کہ موڑنے سے پھٹ جاتا ہے۔''

اسی صفحہ نمبر ۱۴ کے حاشیے پر، پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے یہ بھی لکھا:

''سیر الاولیاء (مطبوعہ چرنجی لال) کی ایک جلد مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) لائبریری میں تھی۔ میں نے اس کو تین چار دفعہ پڑھا لیکن ہر صفحہ الٹنے سے پھٹ جاتا تھا، اس لیے کتاب بے کار ہوگئی۔ پروفیسر (خلیق احمد) نظامی صاحب کے پاس ''سیر الاولیاء'' کا نسخہ ہے اور انہوں نے (میری) یہ کتاب تیار کرنے کے لیے مجھے اپنی کتاب مستعار دی ہے لیکن میں اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔''

''سیر الاولیاء'' کا یہ ۱۱۹ سالہ پرانا مطبوعہ اڈیشن جو آج بھی ''چرنجی لال اڈیشن'' کے نام سے مشہور ہے اور جس کی وجہ سے آج تک چرنجی لال کا نام روشن ہے، تقریباً ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ''سیر الاولیاء'' کے قدیم قلمی نسخوں کی طرح اب ''سیر الاولیاء'' کا چرنجی لال اڈیشن بھی تقریباً نایاب ہو چکا ہے اور اگر کہیں ہے تو اس کی حالت کا بیان اوپر درج ہے۔

چرنجی لال اڈیشن کی طباعت کے ۹۳ برس بعد، ۱۹۷۸ء میں، مرکزِ تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے اس اڈیشن کو مطبع معارف، شارع گنج بخش، لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۶۰۶ ہے۔ پہلے دس صفحات ''فہرست مندرجات'' اور (چرنجی لال کے یکم مئی ۱۸۸۵ء کے تحریر کردہ) دیباچے پر مشتمل ہیں۔ اس تفصیل میں جاتے، اور اسے بیان کرنے، کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اس کتاب کے گزشتہ، یا آئندہ، صفحات میں، بابا صاحب کے فاضل سوانح نگاروں نے جہاں چرنجی لال (دہلی۔۱۸۸۵ء) اڈیشن کے کسی خاص صفحے کا حوالہ دیا ہے تو وہ صفحہ لاہور۔ ۱۹۷۸ء اڈیشن میں دس صفحات آگے ہوگا۔ مثلاً ''سیر الاولیاء'' کے چرنجی لال (دہلی۔۱۹۷۸ء) اڈیشن کے صفحہ نمبر ۹۱ کا متن، من وعن، لاہور۔۱۹۷۸ء اڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۰۱ پر ہوگا۔

اس ضمن میں بتانے والی آخری بات یہ ہے کہ چرنجی لال (لاہور۔۱۹۷۸ء)

کے اڈیشن میں، ''سیر الاولیاء'' کے اصل متن کے ۵۹۲ صفحات میں سے آخری تقریباً ۱۲ صفحات (صفحہ نمبر ۵۹۱ تا ۶۰۲) کا متن برٹش لائبریری لندن کے قلمی نسخے میں نہیں ہے۔ ان ۱۲ صفحات کا متن ''تقریباً'' وہی ہے جو کراچی کے عجائب خانے کے قلمی نسخے کے ان ۱۳ صفحات کا ہے جن کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ وہ ''بعد کا اضافہ'' ہیں۔

بالائی سطور میں ''تقریباً'' کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ چرنجی لال اڈیشن کے ان ۱۲ اضافی صفحات کے بالکل آخر میں جو دو تین سطریں ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ برٹش لائبریری لندن کے مخطوطے میں نہیں بلکہ کراچی کے عجائب خانے کے مخطوطے میں بھی نہیں۔ یعنی چرنجی لال اڈیشن میں ان دو تین سطور کا اضافہ درحقیقت ''اضافہ در اضافہ'' ہے۔ ان سطور کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''سلطان فیروز شاہ کی تاریخ وفات ''فوتِ فیروز'' ہے جس سے سنہ ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) نکلتا ہے۔ اس کی مدتِ حکومت ۳۷ سال تھی۔''

(سیر الاولیاء کا اردو ترجمہ مطبوعہ اردو سائنس بورڈ، لاہور۔ سنہ اشاعت: ۲۰۰۴ء۔ صفحہ نمبر: ۸۹۵)

پچھلے صفحات میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ ''سیر الاولیاء'' کے مؤلف امیر خورد کرمانی کا سنہِ وفات ۷۷۰ھ (مطابق ۶۹۔۱۳۶۸ء) ہے۔ امیر خورد کرمانی ۹۰ سالہ سلطان فیروز شاہ تغلق کی وفات سے تقریباً ۱۹ برس پہلے انتقال کر چکے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ امیر خورد اپنی تاریخی تالیف ''سیر الاولیاء'' کا اختتام سلطان فیروز شاہ تغلق کا سنہِ وفات دے کر کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اضافی فقرے ''سیر الاولیاء'' کے کسی مخطوطے میں بعد میں رقم کیے گئے اور جس مخطوطے میں یہ رقم ہوئے، اسی سے چرنجی لال نے ۱۸۸۵ء میں ''سیر الاولیاء'' کا یہ اڈیشن طبع کرایا اور اس طرح یہ اضافی فقرے بھی ان دوسرے اضافی فقروں کی طرح، جن کا ذکر بعد میں آئے گا، ''سیر الاولیاء'' کے متن کا، غلط طور پر، حصہ

بن گئے۔

کول کتے کے مخطوطے میں صورتِ حال خاصی گنجلک ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطہ ورق نمبر ۳۵۰ (a) پر ختم ہو گیا جس کا آخری فقرہ یہ ہے:

"ونفس آں بادشاہ زادہ درکار شد"

یاد رہے کہ برٹش لائبریری لندن کا مخطوطہ بھی اسی فقرے پر ختم ہوتا ہے۔ اس فقرے کے بعد، کول کتے کے مخطوطے میں ڈیڑھ اوراق (تقریباً ڈھائی صفحات) خالی ہیں جس سے تاثر ملتا ہے کہ کتاب ختم ہو گئی ہے، تاہم ان ڈھائی خالی صفحات کے بعد ورق نمبر ۳۵۲ (a) آتا ہے جہاں سے ایک ضمیمہ یا اضافی تحریر شروع ہوتی ہے جو آٹھ اوراق/سولہ صفحات پر مشتمل ہے اور مذکورہ بالا ورق نمبر ۳۵۲ (a) سے ورق نمبر ۳۶۰ (b) پر محیط ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ برٹش لائبریری لندن کا ۶۰۳ صفحات پر مشتمل مخطوطہ اس فقرے پر ختم ہوتا ہے:

"ونفس آں بادشاہزادہ درکار شد"

کراچی میوزیم کے ۶۷۲ صفحات پر مشتمل مخطوطے میں، مندرجہ بالا فقرے کے بعد، تقریباً ۱۳ صفحات اضافی پائے جاتے ہیں اور متن کا آخری صفحہ نمبر ۶۷۲، اس فقرے پر ختم ہوتا ہے:

"بہ ضرورت بر تختِ سلطنت جلوس فرمود و مردم را از محنت و اندوہ آسودہ گردانید۔"

چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) اڈیشن میں، مندرجہ بالا فقرے کے بعد، مندرجہ ذیل الفاظ اضافی ہیں جنہیں "اضافہ در اضافہ" کہنا چاہیے:

"تاریخِ وفاتِ سلطان فیروز شاہ "فوتِ فیروز" (۷۸۹ھ) است کہ

ہفصد و ہشتاد ونہ است، ومدتِ سلطنتِ اوسی و ہفت (۳۷) سال بود۔"

ایشیاٹک سوسائٹی میوزیم کے مخطوطے میں، چرنجی لال اڈیشن کے مندرجہ بالا "اضافہ در اضافہ" کے بعد مزید ڈھائی صفحات کا اضافہ پایا جاتا ہے جو "اضافہ در اضافہ در اضافہ" ہوا۔

اس کتاب کے اگلے صفحات میں جو کچھ بیان کیا جائے گا، اسے واضح کرنے کے لیے، یہاں یہ وضاحت، جو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، ضروری ہے کہ فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بارے میں کول کتے کے مخطوطے اور چرنجی لال اڈیشن میں یہ اضافی اندراج امیر خورد کرمانی کے قلم سے نہیں ہوا بلکہ ان کی وفات کے بعد، اسے ان کے سر تھونپ کر سیر الاولیاء کا حصہ بنا دیا گیا اور سمجھا جاتا رہا، اور جب تک اس اضافی اندراج، اور اس نوع کے دوسرے اضافی اندراجات، کا پورا تجزیہ اور پس منظر پیش نہ کیا جائے، ایک عام قاری جو اولیاء اللہ کے بارے میں ایسی کتابیں عقیدت اور احترام سے پڑھتا ہے، اسے امیر خورد کرمانی کی تحریر اور سیر الاولیاء کا حصہ سمجھے گا، نہ کہ اس میں ہونے والا ما بعد کا اضافہ۔

چرنجی لال اڈیشن (۱۸۸۵ء) کا اردو ترجمہ، ۱۹۲۳ء میں، لاہور سے شائع ہوا۔ چرنجی لال فارسی اڈیشن کی طرح یہ مطبوعہ اردو ترجمہ بھی اب تقریباً نایاب ہے۔ ۵۷ برس بعد، ۱۹۸۰ء میں، مرکزی اردو بورڈ، ۲۹۹/ اپر مال، لاہور نے اردو ترجمہ پھر شائع کیا۔ ۱۹۷۸ء کا مطبوعہ چرنجی لال فارسی اڈیشن اور اس کا ۱۹۸۰ء کا اردو ترجمہ بھی اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ہمیں ۱۹۷۸ء کے بعد سیر الاولیاء کے کسی فارسی اڈیشن کی طباعت کا تو علم نہیں، تاہم ۲۰۰۴ء میں اردو سائنس بورڈ لاہور نے اس کا اردو ترجمہ ایک بار پھر شائع کر دیا ہے جو اس کا پانچواں اڈیشن ہے۔

اس طرح اب ۲۰۰۴ء میں، وہ مرحلہ آن پہنچا ہے جہاں ہم مندرجہ بالا تین

قدیم قلمی نسخوں، ایک مطبوعہ فارسی کتاب، اور اس مطبوعہ کتاب کے اس نئے اردو ترجمے، یعنی پانچ کتابوں کی روشنی میں سیر الاولیاء سے منسوب اس کلیدی اقتباس کا تقابلی جائزہ پیش کریں جس کا حوالہ دے کر صدیوں سے، بابا صاحب کا سنہِ وصال ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء بیان کیا جاتا رہا ہے:

دیکھیئے ''کلیدی اقتباس کا تقابلی جائزہ'' (A)

مندرجہ بالا اقتباس کے سرسری تقابلی جائزے سے، سب سے پہلی حقیقت یہ کھلتی ہے کہ کلیدی پیرے کا وہ حصہ جو سیر الاولیاء کے سر منڈھ کر، نہ جانے کب سے بابا صاحب کے سالِ وصال کا منبع اور ماخذ بنا رہا ہے، صرف چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) کے مطبوعہ فارسی اڈیشن کے متن میں طبع ہوا ہے۔ خدا جانے اس کا قلمی نسخہ اب کہاں اور کس حال میں ہو؟ پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا ہے کہ یہ مطبوعہ فارسی اڈیشن جس قلمی نسخے سے تیار کیا گیا، وہ قلمی نسخہ کیسے ملا؟ کیسے کتابت ہوا اور اس قلمی نسخے کا معیار کیا تھا؟ اگر قلمی نسخہ سامنے ہوتا تو معلوم ہوتا کہ یہ کلیدی پیرا واقعی اس قلمی نسخے کے متن میں ہی درج تھا یا متن کے باہر، اس کے حاشیے میں، وضاحت کے طور پر الگ لکھا گیا تھا۔ نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ پیراگراف کا یہ حصہ سیر الاولیاء کے قدیم ترین قلمی نسخے یعنی ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا کے قلمی نسخے اور کراچی میوزیم کے قلمی نسخے میں تو سرے سے نہیں ہے اور برٹش لائبریری لندن کے دوسرے قدیم ترین اور مصدقہ قلمی نسخے میں بھی اس کے متن میں نہیں بلکہ اس کے ورق نمبر ۴۷/ صفحہ نمبر ۹۲ کے بائیں جانب سرخ لکیروں سے گھرے ہوئے ایک لمبے چوڑے حاشیے میں، دو حصوں میں، درج ہے۔ پہلا حصہ 'پوشیدہ نماند' کے الفاظ سے شروع اور 'واللہ اعلم' کے الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ 'وارادت آوردن' کے الفاظ سے شروع اور 'در قید حیات بود' کے الفاظ پر ختم ہوتا

ہے۔ چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) کے مطبوعہ اڈیشن اور برٹش لائبریری لندن کے قلمی نسخے میں پیراگراف کے اس حصے کے الفاظ کا تقابلی جائزہ یہ ہے:

دیکھیے ''تقابلی جائزہ'' (B)

یہاں یہ پوشیدہ نہ رہے کہ برٹش لائبریری لندن کے قلمی نسخے کے متن میں ایسی کوئی علامت موجود نہیں جو یہ نشان دہی کرتی ہو کہ مندرجہ بالا طویل فقرہ چونکہ متن میں کتابت ہونے سے رہ گیا تھا، اس لیے اس کی کتابت متن سے باہر کی گئی ہے، نہ ہی متن کے باہر اور اس طویل حاشیے کے آغاز، اختتام یا کہیں اور اس نوع کا کوئی نشان 'یا اشارہ' موجود ہے جو اسے متن کے کسی فقرے سے جوڑے۔ ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ نہ صرف متن سے باہر اور سرخ حاشیے کی لکیروں کے درمیان لکھے جانے والے مندرجہ بالا (اضافی) فقرے کے حروف، متن کے حروف سے واضح طور پر چھوٹے ہیں بلکہ ان کا طرزِ کتابت بھی نمایاں طور پر مختلف ہے۔ یہ شواہد بتاتے ہیں کہ یہ فقرہ نہ صرف برٹش لائبریری لندن کے مخطوطے کے متن کا حصہ نہیں تھا، بلکہ وضاحتی نوٹ کے طور پر بھی حاشیے (SIDE NOTE) میں، بعد میں، لکھا گیا اور اسے دوسرے قلمی نسخوں میں حاشیے کی بجائے متن کا حصہ بنانا اس کے بھی ''بعد کا اضافہ'' ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ فقرہ وضاحتی تھا، متن کا حصہ نہ تھا، بلکہ حاشیے میں بھی بعد میں لکھا گیا۔ لیکن بعد میں وہ وضاحتی کے بجائے، اضافی بن کر، دوسرے قلمی نسخوں میں، متن کا حصہ بنا دیا گیا۔

دوسری حقیقت جو متن کے غیر متنازعہ اقتباس کو (جو پچھلے صفحات میں (A) پر ہے) دو تین بار غور سے پڑھ کر عیاں ہوتی ہے، یہ ہے کہ اس مختصر سے غیر متنازعہ اقتباس میں، بابا صاحب کو سیر الاولیاء کی چاروں فارسی کتابوں میں، تین بار ''شیخ شیوخ العالم'' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے لیکن ایک بار بھی ان کے لیے ''گنج شکر'' کے الفاظ بالکل

تقابلی جائزہ (B)

چرنجی لال (لاہور ۱۹۷۸ء) ۔ صفحہ ۱۰۱ کا متن	برٹش لائبریری لندن کا قلمی نسخہ۔ ورق نمبر ۴۷/صفحہ نمبر ۹۲ کا حاشیہ
پوشیدہ نماند کہ تولدِ حضرت شیخ الشیوخ	پوشیدہ نماند کہ مولود حضرت
فرید الحق والدّین مسعود گنج شکر	---------- گنج شکر
در سنہ ۵۶۹ پانصد و شصت و نہٗ بود	در سنہ پانصد شست و نہٗ بود
و وفاتِ حضرت ایشاں در شش صد و شصت و چہار بود	و وفاتِ حضرت ایشاں در ششصد وشست چار بود
عمر حضرتِ ایشاں نوَ دو پنج باشد واللہ اعلم	کہ عمرِ حضرت ایشاں نود نخ باشد واللہ اعلم
و ارادت آوردن حضرت گنج شکر بحضرت خواجہ	و ارادت آوردن حضرت گنج شکر بحضرت خواجہ
قطب الدین قدس اللہ سرہما العزیز در پانصد و ہشتاد و چہار ۵۸۴ بود	قطب الدین در پانصد ہشتاد چہار بود
بعد از ارادت آوردن ہشتاد سال	وبعد ارادت آوردن ہشتاد سال
در عقد حیات بود	در قید حیات بود ۱۲
طیب اللہ مرقدہٗ وجعل حظیرہ القدس مشواہ۔	---------------

(نوٹ: لندن کے قلمی نسخے کے الفاظ جس طرح اس میں لکھے گئے ہیں، ویسے ہی یہاں بھی نقل کر دیئے گئے ہیں۔)

درخشت فرود آوردند تا در لحد خرج شد طیب اللہ مرقدہ وجعل خطیرۃ القدس مثواہ پوشیدہ نماند کہ تولد حضرت شیخ الشیوخ فرید الحق والدین مسعود گنجشکر در سنہ ۵۶۹ پانصد و شصت و نہ بود و وفات حضرت ایشان در شش صد و شصت و چہار بود عمر حضرت ایشان نود و پنج باشد واللہ اعلم وارادت آوردن حضرت گنجشکر بحضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہما العزیز در پانصد و ہشتاد و چہار بود بعد از ارادت آوردن ہشتاد سال در عقد حیات بود طیب اللہ مرقدہ وجعل خطیرۃ القدس مثواہ از حضرت سلطان المشائخ پرسیدند کہ عمر شریف حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز چند سال بود فرمودند کہ نود و پنج سال و بوقت نقل این سخن میگفت یا حی یا قیوم سلطان المشائخ فرمود کہ اول شیخ سعد الدین حمویہ نقل کرد بعد از وے بسہ سال شیخ سیف الدین باخرزی بعد از وے بسہ سال شیخ بہاؤ الدین زکریا بعد از وے بسہ سال شیخ شیوخ العالم فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز سلطان المشائخ مے فرمود کہ خوش عہدے بود کہ پنج بزرگوار در حیات بودند شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین و شیخ ابو الغیث یمنی و شیخ سیف الدین باخرزی و شیخ سعد الدین حمویہ و شیخ بہاؤ الدین زکریا قدس اللہ سرہم العزیز این ضعیف گوید قطعہ شیخ اعظم فرید ملت و دین + شیخ ابو الغیث و شیخ سیف الدین + شیخ سعدی حمویہ شیخ الوقت + شیخ صاحب نفس بہاؤ الدین + بود ہر پنج پیر در یک عصر + ہر یکے بادشاہ دنیا و دین + منہم آں سلطان المشائخ + آں برہان الحقائق + آں سرور اولیائے دین + آں پیشوائے اصفیائے عالم یقین + آں عالم علوم ربانی + آں کاشف اسرار رحمانی + آں بظاہر و باطن آراستہ + و بوجود مبارک خود امور عالم پیراستہ + آں والہ صفات حق جل و علی + آں عاشق ذات باری تعالی + آں معدن کان کرامت + آں صورت لطافت + آں بکثرت بکامیاں اولیا معروف + آں بہمہ اوصاف گزیدہ + میان اصفیا موصوف + تبعے

چرنجی لال کے مطبوعہ اڈیشن کے صفحہ نمبر 101 کا عکس

که بجهت لحد شیخ شیوخ العالم خشت خام حاجت شد و موجود نمی

شیخ شیوخ العالم که بخشت خام برآورده بودند از آن خشت

تا در لحد شیخ خرج شد طیب الله مرقده و جعل حظیرة القدس مثوه

المشایخ میفرمودند که عمر شیخ شیوخ العالم فرید الدین قدس الله

بوده فرمودند که نود و پنج سال و بوقت نقل این سخن میگفت

قیوم و سلطان المشایخ فرمود که اول شیخ سعد الدین حمویه

از نود و سه سال شیخ سیف الدین باخرزی بعد از نود و سه سال شیخ

ذکریا بعد از نود و سه سال شیخ شیوخ العالم فرید الدین قدس الله

سلطان المشایخ میفرمود که خوش عهدی بود که پنج بزرگوار در حیو

شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین و شیخ ابو الغیث یمنی و شیخ سیف

باخرزی و شیخ سعد الدین حمویه و شیخ بهاء الدین ذکریا قدس الله

این ضعیف گوید: شیخ اعظم فرید ملة و دین شیخ ابو الغیث

سیف الدین شیخ سعد حمویه شیخ الوقت شیخ صاحب نفس بها

بوده هر پنج پیر در یک عصر هر یکی پادشاه دنیا و دین آن

المشایخ آن برهان حقایق آن سرور اولیاء دین آن پیشوای اصحا

یقین آن عالم علوم ربانی و آن کاشف اسرار رحمانی

باطن آراسته و بوجود مبارک خود امور عالمی بیاراسته و آن

کول کتہ میوزیم کے مخطوطے کے ورق نمبر 36 (b) کا عکس

نظام الدین امده ولیکن چه سود که طاقت نشد چون باید دسید خواستند
درون درآید نزدیک دروازه رسیده بود که جنازه شیخ شیوخ
العالم بیرون آوردند بغرض برادران را رسید که کجا دفن خواهند
گفتند بیرون حصار نزدیک شهدای که شیخ شیوخ العالم
پیشتر آنجا مشغول بودی و مقامی مروح است خواجه نظام الدین گفت
که شما شیخ شیوخ العالم را بیرون حصار دفن کردند شما را هیچ کس اعتبار
نکند هر که زیارت شیخ شیوخ العالم را بیرون حصار باید هم از بیرون
زیارت کند و بگذرد دیگر . نماز جنازه هم بیرون گزاردند و اتفاق
آن شاهزاده باز درون حصار آوردند و درین مقام که مدفون است
دفن کردند سلطان المشایخ می فرمود در دی بخدمت شیخ شیوخ العالم
فرید الحق والدین قدس الله سره العزیز آمده و گفت اگر فرمان باشد
حجره برای مسکینان که از بیرون آب و هیزم می آرند از خشت بنا کنم شیخ
شیوخ العالم فرموده بود که مدت هفت سال است گرشنود شنیده نیست کرده
است که خشت بر خشت نشود القصه آن مرد اولاد شیخ را ابرام داشت
در حجره عمارت شود همچنان شد فاما بعد نقل شیخ شیوخ العالم آن حجره در
خراب کردند و روضه منوره که شیخ شیوخ العالم همانجا شد سلطان المشایخ
می فرمود که بجهت لحد شیخ شیوخ العالم خشت خام حاجت شده چون
موجود نمی شود در خانه شیخ شیوخ العالم که خشت خام برآورده بودند
بنا نشستی فرود آوردند تا در لحد شیخ خرج شده طلبید آنقدر فرسته و

کراچی میوزیم کے صفحہ نمبر 112 کا عکس

ویسے ہی استعمال نہیں کیے گئے جیسے فوائد الفواد میں خواجہ نظام الدین اولیاء نے بابا صاحب کا، سو بار، ذکر کیا لیکن ایک بار بھی ان کے ساتھ ''گنج شکر'' کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔

(B) مندرجہ بالا وضاحتی حاشیے ''یا اضافی فقرے'' میں جس کا تقابلی جائزہ اوپر پر دیا گیا ہے، معاملہ برعکس ہے۔ برٹش لائبریری لندن کے قلمی نسخے کے حاشیہ بند فقرے میں (جو متن سے باہر ہے) بابا صاحب کے لیے ''شیخ شیوخ العالم'' کا لقب سرے سے استعمال ہی نہیں ہوا اور اس کے برعکس ''گنج شکر'' کے الفاظ جو اس نسخے کے متن میں ایک جگہ بھی استعمال نہیں ہوئے تھے، حاشیے میں پہلی بار استعمال کیے گئے ہیں۔

اب ان ہی خطوط پر، چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) اڈیشن میں درج شدہ اس اضافی فقرے کی ترکیب پر غور کریں۔ اولاً یہاں ''شیخ شیوخ العالم'' کے بجائے ''شیخ الشیوخ'' لکھا گیا ہے اور ثانیاً یہاں بھی ''مسعود گنج شکر'' اور ''حضرت گنج شکر'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک چھوٹے سے پیراگراف میں ایک مصنف کے قلم سے اس پیراگراف کے آغاز اور اختتام کے درمیان اتنی ساری تبدیلیاں ایک دم ہوجانا عجیب سا لگتا ہے۔

تیسری حقیقت جو اس اقتباس کو ایک نظر دیکھتے ہی واضح ہوجاتی ہے، یہ ہے کہ کول کتے، لندن اور کراچی کے قلمی نسخوں میں بات سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے فرمودے سے شروع ہوکر ان ہی کے اس فرمودے پر ختم ہوتی ہے کہ بابا صاحب نے ۹۵ برس کی عمر پائی۔ بابا صاحب کے ذکر کے لیے اس سے بہتر راوی اور اس سے بہتر آغاز اور اختتام کیا ہوسکتا ہے؟ اس پورے اقتباس کے الفاظ اور طرزِ تحریر میں ایک فطری بے تکلفی، ربط اور بہاؤ ہے۔ اس کے برعکس اضافی فقرہ پڑھیں تو اس کے تمہیدی رسمی الفاظ یعنی ''پوشیدہ نہ رہے'' سے ہی تحریر کا فطری ربط ٹوٹ جاتا ہے اور صاف

معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ وضاحتی نوٹ کے طور پر درج کیا گیا ہے اور پھر الفاظ کی وہ تکرار تو خصوصاً نظروں کو بہت چبھتی اور دماغ میں بہت بڑا سوال بن کر ابھرتی ہے جس میں اس مختصر سے اقتباس کے آخر میں دوبار یہ لکھا گیا ہے کہ بابا صاحب کی عمر پچانوے برس تھی۔ عمر کا ذکر ایک بار کافی تھا۔ صرف چند الفاظ کے بعد، اسے پھر سے دہرانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ یہ شکوک اس اضافی تحریر کو (جو صرف چرنجی لال اڈیشن کے متن میں اضافی تحریر کے طور پر متن کا حصہ بنی ہوئی ہے) مزید مشکوک بنا دیتے ہیں۔ لندن کے مخطوطے میں یہ تحریر حاشیہ یا SIDE NOTE کے طور پر ہے، اضافی تحریر نہیں۔

چوتھی، اور آخری، حقیقت کی نشان دہی، اخلاق حسین دہلوی مرحوم برسوں پہلے کر چکے ہیں، جو یہ ہے کہ چرنجی لال اڈیشن کے اس اضافی فقرے میں بابا صاحب کی ولادت اور وفات کے سنین فارسی زبان کے الفاظ میں لکھے گئے ہیں، جب کہ سیر الاولیاء میں سنین فارسی زبان کی بجائے عربی زبان کے الفاظ میں لکھے گئے ہیں۔ اس بارے میں مزید تفصیلات اور تبصرے ہم اس کتاب کے چوتھے حصے کے لیے مؤخر کر رہے ہیں جس میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ بابا صاحب کا صحیح سالِ وصال کیا ہے۔ اخلاق حسین دہلوی مرحوم کے اس اہم نکتے، اور نکتہ آفرینی، کی تائید میں (جو انہوں نے صرف چرنجی لال اڈیشن کی بنیاد پر کیا تھا) یہاں صرف یہ لکھنا کافی بھی ہے اور ضروری بھی کہ سیر الاولیاء کے کول کتے، لندن، کراچی اور چرنجی لال غرضیکہ سب نسخوں میں بابا صاحب اور خواجہ صاحب کے مابین ہونے والی روح پرور گفتگو میں جو جمادی الاولیٰ اور شعبان ۶۶۹ھ (مطابق ۱۲۷۱ء) میں ہوئی، سنہ ۶۶۹ھ کا اندراج فارسی زبان کے الفاظ (شش صد وشصت ونُہہ) کی بجائے، ہر بار، عربی زبان کے الفاظ (تسع وستین وستماتیہ) میں کیا گیا ہے۔ اور رمضان کا سنہ درج کرتے ہوئے اگرچہ کول کتے اور کراچی کے مخطوطات میں ایک لفظ ''تسع'' بمعنے ''نَو'' کی کتابت نہیں ہوئی لیکن سنہ کے بقیہ الفاظ

''ستین وستماتیہ'' بدستور عربی زبان میں ہی ہیں۔

مندرجہ بالا کوائف اور بحث سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ چرنجی لال اڈیشن کے متن میں یہ بے ربط فقرہ جو ''پوشیدہ نماند'' سے شروع ہوکر ''در عقدِ حیات بود'' پر ختم ہوتا ہے، سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد کرمانی کا نہیں۔ انہوں نے تو سیر الاولیاء میں اپنے پیرومرشد خواجہ نظام الدین اولیاء اور اپنے پیر بھائی امیر خسرو تک کا سنہِ ولادت نہیں لکھا، وہ مندرجہ بالا اضافی فقرے میں بابا صاحب کا سنہِ ولادت کیسے لکھ دیتے؟ مانا کہ تاریخ کی کتابوں میں غلط بیانیاں ہوتی رہی ہیں اور اس سے مستثنیٰ نہ تو سیر الاولیاء کے فارسی نسخے ہیں اور نہ ہی سیر الاولیاء کے اردو تراجم جہاں ایک مترجم نے اردو ترجمے میں خواجہ نظام الدین اولیاء کا (غلط) سنہِ ولادت اپنی طرف سے لکھ ڈالا۔ لیکن ہر غلطی کی کوئی وجہ اور ہر غلط بیانی کا کوئی محرک ہوتا ہے۔ یہاں وجہ اور محرک ہی پوشیدہ ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اضافی فقرہ لکھنے کی تحریک اس کاتب کو تو ہو نہیں ہوسکتی جو اجرت پر کتابت کرتا ہے۔ اچھے سے اچھا کاتب کسی کتاب کا کوئی حرف، لفظ، یا فقرہ چھوڑ تو سکتا ہے جس کی ایک جھلک ہمیں مندرجہ بالا اقتباس کے بغور تقابلی جائزے سے بھی نظر آجائے گی لیکن برے سے برے کاتب سے بھی یہ توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی کہ وہ، بیٹھے بٹھائے، پہلے دنیا بھر کے سامنے یہ باضابطہ اعلان کرے کہ کسی سے ''پوشیدہ نہ رہے'' اور پھر بابا صاحب کا سنہِ ولادت اور سالِ وصال اپنی طرف سے تصنیف کرڈالے اور وہ بھی سراسر غلط، اور اس طرح صدیوں تک ایک دنیا کو ایک چکر میں ڈال دے۔

کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ ''پوشیدہ نہ رہے'' کے الفاظ سے شروع ہونے والے اس ایک طویل فقرے کی 'حاشیہ آرائی' نے بابا صاحب کے صحیح سالِ وصال کو صدیوں تک ایسا ''پوشیدہ'' کردیا کہ صرف سترھویں صدی عیسوی کے علماء ہی نہیں، بلکہ اکیسویں صدی عیسوی میں بابا صاحب کا زندگی نامہ لکھنے والے بھی جو سابق وزیرِ قانون

اور اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے سابق رکن ہونے کے علاوہ بابا صاحب کے سچے عقیدت مند کہلاتے ہیں اور بابا صاحب پر لکھی جانے والی اپنی کتابوں کو اپنی "زندگی کا سب سے اہم تخلیقی اور تحقیقی کارنامہ" سمجھتے ہیں، ۲۰۰۲ء میں بھی بدستور، ۱۲۶۵ء (مطابق ۶۶۴ھ) کو ہی بابا صاحب کا سالِ وصال سمجھ رہے اور ایک عالم کو بتا رہے ہیں۔ یہ اس کے باوجود ہوا اور ہو رہا ہے (اور امید ہے کہ انشاء اللہ اب نہ ہوگا) کہ حقیقت آنکھوں کے عین سامنے تھی اور ہے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ اتنی طویل اور مؤثر نظر بندی شاید ہی کبھی ہوئی ہو اور اس میں شاید کوئی مصلحت ہو۔ واللہ اعلم

سطورِ بالا میں تین سوالات اٹھائے گئے تھے: (۱) "اضافی فقرے کا اضافہ کب ہوا؟" جواب یہ ہے کہ اتنی صدیاں گزرنے کے بعد اب اس کا تعین ممکن نہیں۔ (۲) "اضافہ کس نے کیا؟" اس کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے سوال کا تھا۔ (۳) "اضافہ کیوں کیا گیا؟" اس بارے میں گو حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن قیاس ضرور کیا جا سکتا ہے۔

پچھلے صفحات میں ذکر آیا تھا کہ ۱۶۰۵ء میں سیر الاولیاء کے کول کتے کے مخطوطے کی کتابت مکمل ہونے کے بعد کسی بزرگ کو خیال آیا کہ اس میں خواجہ نظام الدین اولیاء اور امیر خورد کے شجرہ ہائے نسب نہیں ہیں تو انہوں نے مخطوطے میں تقریباً ڈھائی صفحات کا اضافہ کروا ڈالا۔ اس نظیر کی بنیاد پر، چرنجی لال اڈیشن میں پائے جانے والے اس بے ربط اور نامانوس الفاظ پر مشتمل اضافی فقرے کے بارے میں بھی یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سیر الاولیاء کے کسی ابتدائی مخطوطے کی کتابت مکمل ہونے کے بعد جب کسی بزرگ نے یہ دیکھا ہو کہ امیر خورد کرمانی نے سیر الاولیاء میں نسبتاً کم اہم واقعات کے سنین تو پوری شرح وبسط سے لکھ دیئے لیکن سیرتِ اولیاء کی اس بنیادی کتاب میں بابا صاحب کا سنہ ولادت نہ سہی، سالِ وصال کا ذکر بھی نہیں کیا، جو ایک

واقفِ حال سوانح نگار ہونے کی حیثیت سے ان کے ذاتی علم میں ہوگا اور ان کا فرض بنتا تھا، تو سیر الاولیاء کا یہ ناقابلِ فہم خلا پُر کرنے کے لیے، ان دردمند اہلِ قلم نے، جن کی شناخت ہم سے پوشیدہ ہے، بابا صاحب کی ولادت اور وفات کے سنین کی صحت کا تعین کیے بغیر، کتاب کے بائیں جانب کے حاشیے میں، مندرجہ بالا وضاحتی فقرہ اپنی طرف سے لکھ کر اپنی جانب سے یہ خلا پُر کر ڈالا۔ اس کے بعد کتابت ہونے والی بعض قلمی کتابوں (مثلاً لندن کے ۱۶۸۲ء/۱۰۹۳ھ کے مخطوطے) میں تو یہ فقرہ کتاب کے حاشیے یا SIDE NOTE کے طور پر آتا رہا لیکن بعض دوسری قلمی کتابوں میں اسے حاشیے سے نکال کر متن کا (بے جوڑ) حصہ بنا دیا گیا (جو کاتبوں کا کارنامہ بھی ہوسکتا ہے)۔ واضح رہے کہ پہلے زمانے میں قلمی کتابوں کے دائیں بائیں، چوڑے چکلے حاشیے چھوڑ دیے جاتے تھے جن پر تبصرے اور وضاحتیں درج کردی جاتی تھیں، جیسے قرآن کریم کے اکثر نسخوں میں آج بھی شرح یا مختصر تفسیر دائیں صفحے کے دائیں طرف کے حاشیے، اور بائیں صفحے کے بائیں جانب کے حاشیے پر لکھی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں یہ حوالے، وضاحتیں یا مختصر تبصرے کتاب کے صفحات کے دائیں بائیں درج کرنے کی بجائے، جنہیں اردو میں حاشیے اور انگریزی میں SIDE NOTES کہا جائے گا، صفحات کے نیچے درج کیے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں انہیں FOOT NOTES کہا جاتا ہے اور اردو میں زیریں حاشیے، اس وجہ سے اس کا امکان اب کم ہے کہ کوئی زیریں حاشیہ غلطی سے کتاب کے متن کا حصہ بن جائے۔

ہمارا یہ قیاس کہ یہ وضاحتی حاشیہ، یا اضافی فقرہ، خاصی مدت سے موجود تھا، اس بنا پر ہے کہ گیارھویں صدی ہجری/ سترھویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مبینہ طور پر اخبار الاخیار میں، ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳ء میں مولانا محمد علی اصغر چشتی نے مبینہ طور پر جواہر فریدی میں، اور اس کے بعد ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۸ء

کے لگ بھگ دارا شکوہ نے مبینہ طور پر سفینۃ الاولیاء میں، جب بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) لکھا تو وہ کسی ایسی کتاب کی بنیاد پر ہی لکھا ہوگا جو عوام وخواص میں مقام رکھتی ہوگی۔ ہمارے سامنے ان حضرات کے سترھویں صدی عیسوی میں لکھے ہوئے اصل قلمی فارسی نسخے نہیں بلکہ بیسویں صدی عیسوی میں مطبوعہ فارسی کتابیں یا ان کے اردو ترجمے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان تین چار صدیوں میں، سیر الاولیاء کی طرح، ان کتابوں میں بھی ردو بدل کر دیا گیا ہو، تاہم اس مفروضے کی بنا پر کہ ان تینوں کتابوں کے اصل (نایاب) فارسی قلمی نسخوں میں بابا صاحب کا جو سالِ وصال لکھا گیا تھا، وہ وہی تھا جو آج ان کتابوں کے مطبوعہ فارسی اڈیشنوں یا اردو ترجموں میں درج ہے، یہ امکان قرینِ قیاس ہے کہ گیارھویں صدی، ہجری میں (جس کے دوسرے عشرے میں ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا کے مخطوطے اور جس کے آخری عشرے میں برٹش لائبریری لندن کے مخطوطے کی کتابت مکمل ہوئی) سیر الاولیاء کے اس صدی میں پائے جانے والے بعض قلمی نسخوں میں یہ فقرہ غالباً وضاحتی، یا اضافی، حیثیت میں پہلے سے موجود ہوگا۔ اگر اضافی حیثیت سے ہوگا تو متن میں ہوگا۔ اگر وضاحتی حیثیت سے ہوگا تو برٹش لائبریری لندن کے مخطوطے کی طرح، حاشیے میں ہوگا، متن میں نہیں۔

بہر حال یہ ایک علمی بحث ہے جو کہیں مفروضے اور کبھی قیاس پر مبنی ہے۔ عملی سوال یہ ہے کہ ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) بابا صاحب کا سالِ وصال ہے یا نہیں؟ اگر جواب یہ نکلے کہ ۶۶۴ھ بابا صاحب کا سالِ وصال ہو ہی نہیں سکتا، تو پھر اس بات پر بحث وتکرار کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس کی مخالف رائے کے حامل کون ہیں اور وہ کس راہ سے اس رائے پر پہنچے، بلکہ یہ جواب ملنے کے بعد ان قوی شبہات کو یقین کا درجہ حاصل ہو جائے گا جن میں اس اضافی ''فقرے'' کے بارے میں، سطورِ بالا میں، محتاط الفاظ میں، صرف شبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔

دوسرا حصہ

دوسرا سوال: کیا ۶۶۴ھ صحیح سالِ وصال ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

اس سوال کا جواب سلطان غیاث الدین بلبن کے سنہِ تخت نشینی میں عیاں، اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں پنہاں ہے۔ بلبن کی تخت نشینی کی تاریخ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ بتائی جاتی ہے جو عیسوی تقویم کے مطابق ۲۰ فروری ۱۲۶۶ء یا اس کے لگ بھگ تھی۔ بلبن ۲۰ برس سلطان رہا اور ۱۲۸۶ء (مطابق ۶۸۵ھ) میں وفات پائی۔ تاریخ کی واضح اور ٹھوس شہادت کے مطابق بابا صاحب بلبن کے عہدِ سلطانی کے ابتدائی دور میں زندہ تھے۔ سات متعلقہ تاریخی حوالے نیچے درج کیے گئے ہیں:

(1) تاریخ مبارک شاہی مصنف: یحییٰ بن احمد سرہندی
(وفات: ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء تقریباً)

مترجم: ڈاکٹر آفتاب اصغر ناشر: اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹، اپر مال، لاہور

پہلا اڈیشن: ۱۹۷۶ء دوسرا اڈیشن: ۱۹۸۶ء

صفحات نمبر ۱۰۴ اور ۱۰۵

”سلطان (ناصر الدین محمود) نے مشیت ایزدی سے ۱۱ جمادی الاول ۶۶۴ھ کو .... رحلت فرمائی........ امراء وملوک نے تین روز تک سوگ منایا......اور تیسرے روز یعنی ۱۳ جمادی الاول ۶۶۴ھ کو سلطان غیاث الدین بلبن .... سے ...... بیعت لی۔“

''تقویم ہجری و عیسوی'' مرتبہ ابو النصر محمد خالدی اور شائع شدہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے مطابق، ۱۳ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ کو ۲۰ فروری ۱۲۶۶ء تھی۔ قمری تاریخوں کو عیسوی سنین کی تاریخوں میں تبدیل کرنے میں ایک آدھ تاریخ یا دن آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔

(۲) پیام گنج شکر مصنف۔ ڈاکٹر منظور ممتاز

ناشر: نذیر سنز لاہور سال اشاعت ۱۹۹۹ء

صفحات نمبر ۳۰ اور ۶۲

(i) صفحہ نمبر ۳۰:

''سلطان ناصر الدین محمود دسمبر ۱۲۶۵ء میں بیمار ہوا اور فروری ۱۲۶۶ء میں وفات پائی۔''

(ii) صفحہ نمبر ۶۲:

''غیاث الدین بلبن ۱۸ فروری ۱۲۶۶ء کو تخت نشین ہوا۔''

(۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اردو اسلامی انسائیکلو پیڈیا) (جلد نمبر ۴)

پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ سالِ اشاعت: ۱۹۶۹ء

صفحات نمبر ۵۱۷ اور ۵۲۷ پر تحریر ہے:

''غیاث الدین (بلبن) خاندان غلاماں کا نامور بادشاہ، سلطنت دہلی کا فرمانروا (۶۶۴ھ یا ۶۶۵ھ ''تا'' ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء)..........سلطان ناصر الدین محمود نے اسے اپنا نائب الملک بنا دیا..........سلطان کی وفات کے بعد وہ تختِ

دہلی پر متمکن ہو گیا (۶۶۴ھ یا ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء)"

(4) A New History of India by Stanley Wolpert
(Paperback) (3rd edition -1989)
Publisher:Oxford University Press, Karachi
(Page 110)
"Balban ruled as such until 1266 (A.D) when he assumed the title as well as the powers of Sultan."

(5) A History of India (Volume-II) by V.D. Mahajan
(2nd edition-1996)
Publisher: S. Chand & Co Ltd, Ramnagar, New Delhi - (Page-47)
"When Nasiruddin Mahmud died in 1266 (A.D), Balban himself became the Sultan."

(۶) مرآۃ الاسرار مؤلف: شیخ عبدالرحمٰن چشتی
(۱۰۰۰ھ تا ۱۰۹۴ھ/ مطابق ۱۵۹۱ء تا ۱۶۸۴ء)
مترجم: کپتان واحد بخش سیال ترجمے کے ناشر: الفیصل اردو بازار لاہور
سالِ اشاعت: نہیں دیا
صفحہ نمبر: ۱۷۷
"آپ (بابا صاحب) کی وفات..... سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوئی۔"

(۷) تاریخ فیروز شاہی — مولف: ضیاء الدین برنی

مترجم: ڈاکٹر سید معین الحق — سالِ اشاعت: ۲۰۰۴ء

ناشر: اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹، اپر مال، لاہور

صفحہ نمبر ۱۹۳

"یہ عہد ایسے مشائخ کی موجودگی سے مزین اور مشرف تھا کہ ان جیسی ہستی مدت میں ایک پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اس (بلبن) کے عہد کے ابتدائی دور میں، شیخ شیوخ العالم فرید الدین مسعود بہ قیدِ حیات تھے. وہ قطبِ عالم اور مدارِ جہاں تھے۔ اس خطۂ زمین کے لوگوں کو انہوں نے اپنی پناہ اور (اپنے) سائے میں لے لیا تھا...... ان کے قرب اور برکتِ انفاس کی وجہ سے لوگ دین و دنیا کی مصیبتوں سے نجات پاتے تھے اور جو اس کے اہل تھے (وہ) ان کی ارادت کے ذریعے بلند مراتب حاصل کرتے تھے۔"

اس پُر اثر اور واضح بیان پر، جسے کسی مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہ تھی، اس کتاب کے فارسی نسخے کے مترجم ڈاکٹر معین الحق نے اپنے ترجمے کے اسی صفحے (نمبر ۱۹۳) کے زیریں حاشیے میں، خدا جانے اپنی طرف سے، کیوں یہ غیر ضروری اور غلط وضاحت کر ڈالی:

"شیخ فریدالدین گنج شکر نے ۵ محرم ۶۶۴ھ کو وفات پائی۔ بلبن اسی سال، تین ماہ بعد، یعنی جمادی الاولیٰ (۶۶۴ھ) میں تخت پر بیٹھا۔"

جمادی الاولیٰ محرم کے چار ماہ بعد آتا ہے، تین ماہ بعد نہیں، مبینہ وضاحت کی

دوسری اور اصل غلطی اتنی بدیہی اور بنیادی ہے کہ وہ کسی مزید یا تفصیلی تبصرے کی محتاج نہیں۔ تعجب ہے کہ محمد قاسم ہندوشاہ سے لے کر خلیق احمد نظامی مرحوم، نثار احمد فاروقی فریدی اور ڈاکٹر معین الحق وغیرہ نے (۵ محرم) ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کا سالِ وفات لکھنے کے بعد، اپنے قلم سے، بعض اوقات اسی صفحے پر، اور کئی دفعہ چند صفحات آگے پیچھے، خدا جانے کس نظر بندی کا شکار ہو کر، وہ ماہ و سال لکھ کر جو ۵ محرم ۶۶۴ھ کے بعد آتے ہیں، یہ لکھ ڈالا کہ بابا صاحب جو ان حضرات کے مطابق ۵ محرم ۶۶۴ھ کو وفات پا چکے تھے، ۵ محرم ۶۶۴ھ کے بعد کی ان مؤخرالذکر تاریخوں میں زندہ تھے۔ ایک دو سے یہ غلطی سرزد ہوتی تو سمجھ میں آجاتی لیکن یہاں تو ہر ایک ہی اس تیر نظر (بندی) کا شکار نظر آتا ہے۔

یکم جنوری ۱۲۶۶ء کو ۲۲ ربیع الاول ۶۶۴ھ تھا۔ اگر بلبن کی تخت نشینی کی تاریخ (۲۰ فروری) یا مہینے (فروری ۱۲۶۶ء) میں کسی قسم کا اشتباہ ہو، تو بھی تخت نشینی کے سال میں کوئی شبہ نہیں، چنانچہ اگر کسی سوانح نگار نے یہ لکھا ہے کہ بابا صاحب نے یکم جنوری ۱۲۶۶ء/۲۲ ربیع الاول ۶۶۴ھ سے پہلے وفات پائی، تو وہ، اس تاریخی شہادت کی بنا پر، غلط ہوگا۔ ۵ محرم ۶۶۴ھ ۲۲ ربیع الاول ۶۶۴ھ سے پہلے آتا ہے۔ اس لیے ۶۶۴ھ بابا صاحب کا سالِ وصال نہیں ہو سکتا۔

خربوزے، رمضان اور پاک پتن کے آخری قیام کے بارے میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے فرمودات

خواجہ صاحب کو بابا صاحب سے عشق تھا اور یہ عشق لڑکپن سے خواجہ صاحب کے قلب پر نازل کر دیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب ابھی بدایوں میں طالب علم تھے، جو پاک پتن سے سیکڑوں میل دور ہے، بابا صاحب کو دیکھا تک نہ تھا لیکن عشق کا یہ عالم تھا کہ نماز

کے بعد اس وقت تک چین نہ آتا جب تک دس بار ''شیخ فرید الدین'' اور دس بار ''مولانا فرید الدین'' نہ کہہ لیتے۔ جب فوائد الفواد کے مؤلف نے خواجہ صاحب کے ملفوظات شعبان ۷۰۷ھ میں قلم بند کرنے شروع کیے، تو خواجہ صاحب کی عمر (قمری تقویم کے حساب سے) ۶۰ برس کے لگ بھگ تھی اور جب پندرہ برس بعد شعبان ۷۲۲ھ میں آخری گفتگو قلم بند ہوئی تو خواجہ صاحب پچھتر برس کے پیٹے میں تھے۔ اس بڑھاپے میں بھی عشق کا یہ عالم تھا کہ بابا صاحب کا ذکر آجاتا تو خواجہ صاحب کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ بابا صاحب کے مزار پر حاضری ہوجاتی تو یوں لگتا گویا کعبے کی زیارت ہوگئی ہے۔ ادب کا یہ عالم تھا کہ ۶۳ برس کی عمر میں جب خواجہ صاحب اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ بابا صاحب جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور سخت بیمار ہونے کی وجہ سے رمضان کے روزے نہ رکھ سکے، تو صاف صاف یہ کہہ دینے کی بجائے کہ بابا صاحب روزے نہیں رکھتے تھے، ۶۳ سالہ خواجہ نظام الدین اولیاء کا فرمودہ ان انتہائی مودبانہ الفاظ میں ہے:

''رمضان کا مہینا آیا تو حضرت افطار فرماتے تھے۔''

عشق اور احترام کی انگشتری میں جڑا ہوا یہ کوہِ نور، فوائد الفواد کی دوسری جلد کی آٹھویں مجلس کے ملفوظات کے خزانے میں جگ مگا رہا ہے۔ یہ مجلس ۲۷ ربیع الاول ۷۱۰ھ (مطابق ۲۴ / اگست ۱۳۱۰ء) کو دلّی میں منعقد ہوئی۔ ہمارے سامنے اس کا مطبوعہ فارسی متن، اس کے دو اردو تراجم اور ایک انگریزی ترجمہ ہے، جن کا ذکر اس کتابچے کے آخر میں ''حوالہ جات'' کے عنوان کے تحت کیا گیا ہے، اور کتابچے کے چھٹے، اور آخری، حصے میں آگے بھی آئے گا۔ چوں کہ اس اقتباس کے فارسی متن اور اس کے اردو اور انگریزی تراجم میں کوئی فرق نہیں، اس لیے فوائد الفواد کے متعلقہ اقتباس کا صرف وہ اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو خواجہ حسن ثانی نظامی کے فوائد الفواد کے ترجمے

کے صفحات نمبر ۳۶۱ / اور ۳۶۳ پر درج ہے:

"جب شیخ (بابا صاحب) کی بیماری بڑھی اور رمضان کا مہینا آیا تو حضرت افطار فرماتے تھے۔ ایک روز کوئی خربوزہ لایا۔ اس کی قاشیں کر کے شیخ کے سامنے رکھی گئیں۔ شیخ انہیں تناول فرما رہے تھے۔ اس دوران خربوزے کی ایک قاش مجھے بھی مرحمت فرمائی۔ میں نے چاہا کہ کھالوں۔ دل میں خیال تھا کہ دو ماہ تک متواتر روزے رکھ کر اس کا کفارہ ادا کردوں گا۔ یہ دولت کہ خود اپنے ہاتھ سے کوئی چیز عنایت فرماتے ہیں، پھر کہاں ملے گی۔ قریب تھا کہ میں اسے کھالیتا کہ حضرت نے کہا: نہیں مت کھاؤ۔ مجھے تو شریعت کی طرف سے اجازت ہے، تمہیں نہیں کھانا چاہیئے۔"

عشق اور عقیدت سے شرابور اس سادہ اور دل نشین تحریر میں، ہمارے دوسرے سوال کا جواب پنہاں ہے۔ تحریر بتا رہی ہے کہ مہینا رمضان کا ہے، پاک پتن میں موسم خربوزوں کا ہے اور بابا صاحب کی بیماری اتنی بڑھ چکی ہے کہ انہیں شریعت کی طرف سے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ شریعت کی طرف سے اجازت ہو بھی تو بابا صاحب جیسا عظیم مومن جس نے موت سے چند منٹ پہلے عشاء کی نماز، ایک بار نہیں، بلکہ تین بار خشوع وخضوع سے پڑھی ہو، بھلا رمضان کے روزے اس وقت تک کہاں چھوڑتا جب تک مرض الموت بالکل مجبور نہ کردیتا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء کے اس فرمودے کی روشنی میں، دوسرے سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں اب صرف اتنا سا کام کرنا ہوگا کہ کوئی مستند "عیسوی ہجری" تقویم اٹھا کر یہ دیکھ لیں کہ اگر بابا صاحب کا انتقال ۵ محرم ۶۶۴ھ اور روایتاً بروز منگل ہوا تو اس سے تین ماہ پہلے جو رمضان (۶۶۳ھ میں) آیا تھا، اس میں عیسوی

کیلنڈر کے مطابق کون سا مہینا تھا؟ اور کیا اس مہینے میں خربوزے ہوتے ہیں؟ اس کام میں صرف چند منٹ لگتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ۶۶۳ھ کے ماہِ رمضان میں، عیسوی کیلنڈر کی تاریخیں ۱۷ جون سے ۱۶ جولائی تھیں اور سنہ عیسوی ۱۲۶۵ تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی، وسط جون سے وسط جولائی تک پنجاب میں آموں کی بہار تو ہوتی ہے لیکن خربوزوں کا موسم ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ جس کام کے لیے ہمیں پوری تاریخ کھنگالنی پڑتی، وہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ایک اشارے سے منٹوں میں حل ہو گیا اور یہ حل آج سے تقریباً سات سو سال پہلے، ۲۷ ربیع الاول ۷۱۰ھ/ ۲۴ / اگست ۱۳۱۰ء سے کاغذ پر لکھا ہوا موجود ہے اور کروڑوں آنکھیں اسے پڑھ چکی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دین و دنیا دونوں کی کتب کے مطابق ۶۶۴ھ بابا صاحب کا سالِ وصال ہونا، ناممکن ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ۵ محرم ۶۶۴ھ کو منگل نہیں تھا جس کی روایت چلی آ رہی ہے بلکہ ہفتے کا دن تھا اور اس لحاظ سے بھی ۵ محرم ۶۶۴ھ کی روایت غلط ہے۔ اس کے ساتھ ہی، ہمیں یہ تین رہنما اصول بھی ملے:

(۱) بابا صاحب کا سالِ وصال یکم جنوری ۱۲۶۶ء/ ۲۲ ربیع الاول ۶۶۴ھ کے بعد ہے، اس سے پہلے نہیں ہو سکتا۔

(۲) سالِ وصال مندرجہ بالا سنہ کے بعد کے آنے والے قریبی سنین میں ہے، دور کے سنین میں نہیں (کیوں کہ بابا صاحب کا وصال بلبن کے عہد کے ابتدائی دور میں ہوا اور یہ دور (فروری) ۱۲۶۶ء سے ۱۲۸۶ء تک ۲۰ سال پر محیط ہے۔)

(۳) یہ سالِ وصال ایسے موسم میں آیا جس میں (وفات سے تین ماہ قبل) ماہِ رمضان میں، پنجاب میں خربوزوں کی فصل ہوتی ہے۔

یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) جو بابا صاحب کے سالِ وصال کے طور پر مشہور رہا ہے، نہ بابا صاحب کا سالِ وصال ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا گا کہ ۶۶۴ھ کے علاوہ، بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں دیگر روایتیں کیا ہیں؟ وہ کن سے منسوب ہیں؟ اور کیا وہ ان مندرجہ بالا تین رہنما اصولوں پر پوری اترتی ہیں؟

تیسرا حصہ

تیسرا سوال: ۶۶۴ھ کے علاوہ، بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں دیگر کیا روایتیں ہیں؟ وہ کن سے منسوب ہیں؟ اور کس حد تک قابلِ اعتبار ہیں؟

بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں دیگر روایتیں پورے ایک سو سال یعنی ۶۶۰ھ سے ۷۶۰ھ پر محیط ہیں۔ بعض روایات پڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق (جس کا ذکر نیچے آئے گا) جو بیسویں صدی عیسوی کے دو فاضل سوانح نگاروں کی کتابوں میں جدا جدا درج ہے، یہ کہا گیا ہے کہ تاریخِ فرشتہ میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۰ھ بتایا گیا ہے، حالاں کہ تاریخِ فرشتہ میں ۶۶۰ھ کا دور دور تک ذکر نہیں ملتا اور اس میں بابا صاحب کا سالِ وصال، نہ صرف ہندسوں میں، بلکہ اس کے ساتھ عربی الفاظ میں ۷۶۰ھ لکھا ہے۔ اگر اندراج صرف ہندسوں میں ہوتا تو اس قیاس کی گنجائش تھی کہ ممکن ہے کہ یہ ناممکن سالِ وصال یعنی (۷۶۰ھ) لکھتے وقت مصنف یا کاتب سے سہواً ایک ہندسہ الٹ پلٹ ہوگیا ہو۔ الفاظ کی موجودگی میں یہ گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس سے پہلے کہ یہ روایتیں کتابوں کے مکمل حوالوں کے ساتھ پیش کی جائیں، پہلے ان کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) ۶۶۰ھ (بطور سالِ وصال)

اس کا ذکر دو کتابوں میں ہے اور دونوں میں تاریخِ فرشتہ کے حوالے سے ہی ہے۔ جناب طالب ہاشمی اور جناب وحید احمد مسعود فریدی مرحوم نے اپنی تصنیفات میں لکھا ہے کہ تاریخِ فرشتہ کے مطابق بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۰ھ ہے۔ تاریخِ فرشتہ میں کیا لکھا ہے؟ اس کے بارے میں اوپر مختصراً لکھا جا چکا ہے اور بعد میں تفصیلاً لکھا جائے گا۔

(۲) ۶۶۱ھ

اس کا ذکر صرف ایک کتاب میں ہے۔ مصنف وحید احمد مسعود فریدی مرحوم ہیں جن کے اپنے الفاظ میں، انہوں نے حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کی ''تقویت'' پر سالِ وصال ۶۶۱ھ لکھا ہے۔ اس ''تقویت'' کی نوعیت کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ اس کتاب کے چوتھے حصے میں، خواجہ نظام الدین اولیاء کی رہنمائی میں، بابا صاحب کے صحیح سالِ وصال کا تعین کیا گیا ہے اور اس رہنمائی کی جملہ تفصیلات بھی درج کر دی گئی ہیں۔ یہ رہنمائی اتنے واضح الفاظ میں جس سے زیادہ وضاحت ممکن نہیں، پچھلے ساڑھے چھے سو برس سے ہر شخص کی نظروں کے سامنے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر کو نظر نہیں آئی۔

(۳) ۶۶۳ھ

اس کا ذکر دو کتابوں میں ملتا ہے. جناب سلیم یزدانی نے بابا صاحب کی سوانح میں، کسی سند یا ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر، ۶۶۳ھ کو سالِ وصال قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۵ محرم ۶۶۳ھ کو جمعرات کا دن تھا، جب کہ تقویم کے مطابق یہ دن منگل بنتا ہے۔ مولوی نور احمد چشتی کے مطابق، جن کا ذکر بابا صاحب کی مبینہ شاعری پر، پنجابی زبان میں لکھی ہوئی کتاب کے مصنف محمد آصف خان نے اپنی کتاب ''آکھیا بابا فرید نے''

میں کیا ہے، تحقیقاتِ چشتی کے صفحہ نمبر ۲۲۲ پر درج مولوی نور احمد چشتی کے مندرجہ ذیل شعر سے بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۳ھ نکلتا ہے:

بود ذاتش مخزنِ حبِ خدا گنجِ شکر
عقل سالِ نقل او فرمود "محبوبِ خدا"

۶۶۳ھ

(۴) ۶۶۵ھ

اس کا ذکر صرف ایک کتاب میں ہے۔ ڈاکٹر منظور ممتاز نے، جن کا ذکر مختصراً گزشتہ اوراق میں آچکا ہے اور تفصیلاً آگے آئے گا، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "حضرت بابا جی کا وصال ۴ محرم ۶۶۵ھ کو آدھی رات کے لگ بھگ ہوا۔"

(۵) ۶۶۶ھ

اس کا ذکر دو کتابوں میں ہے. اولاً خزینۃ الاصفیاء جس کا حوالہ بابا صاحب کے سالِ وصال کے ضمن میں کئی کتابوں میں ملتا ہے۔ کتاب کا سنہِ تالیف ۱۸۶۴ء (مطابق ۱۲۸۱ھ) ہے یعنی یہ برِ صغیر پاک و ہند کی جنگِ آزادی کے سات برس بعد تحریر ہوئی، مؤلف مفتی غلام سرور لاہوری ہیں۔ اس کتاب کے اردو ترجمے کے مطابق، تاریخِ فرشتہ میں (جس کا ذکر نمبر شمار (۱) پر ہو چکا ہے) بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۶ھ درج ہے۔ یہاں یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ تاریخِ فرشتہ کے حوالے سے ہی بابا صاحب کا سالِ وصال، نمبر شمار (۱) پر، ۶۶۰ھ بھی بیان کیا جاچکا ہے جب کہ تاریخِ فرشتہ میں یہ ۶۷۰ھ لکھا ہے۔ دوسری کتاب جس میں ۶۶۶ھ کو سالِ وصال قرار دیا گیا ہے، خان آصف مرحوم کی "اللہ کے سفیر" ہے جو ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۱ء کے درمیان چار بار چھپ چکی ہے اور جس میں، دوبار، کسی سند یا ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر، ۶۶۶ھ سالِ وصال بتایا گیا ہے۔

(۶) ۶۶۷ھ

اس کا ذکر صرف ایک کتاب میں ہے۔ خزینۃ الاصفیاء کے اردو ترجمے (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) میں تحریر ہے کہ مخبر الواصلین اور تذکرۃ العاشقین کے علاوہ شجرۂ چشتیہ میں معتبر اقوال کے ساتھ (باباصاحب کا سالِ وصال) ۶۶۷ھ لکھا ہے۔''

تذکرۃ العاشقین ہمارے سامنے نہیں۔ مخبر الواصلین میں کیا ہے؟ اس کا ذکر بعد میں ایک سے زیادہ جگہ آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتانا کافی ہے کہ مخبر الواصلین میں باباصاحب کا سالِ وصال ۶۶۷ھ نہیں لکھا۔ یہاں یہ ذکر بھی ہوجائے کہ ۱۹۶۲ء میں عالمِ اسلام کے جید عالم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ خزینۃ الاصفیاء میں، ''بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین'' باباصاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ھ درج ہے۔ اسی طرح طالب ہاشمی اور وحید احمد مسعود فریدی مرحوم نے بھی اپنی کتابوں میں خزینۃ الاصفیاء کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ خزینۃ الاصفیاء میں باباصاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ھ درج ہے۔ خزینۃ الاصفیاء کا حوالہ دیتے ہوئے باباصاحب کے دیگر سوانح نگاروں نے کیا لکھا، اس کا ذکر ان سوانح نگاروں کے ساتھ آئے گا۔ ہمیں علم نہیں کہ خزینۃ الاصفیاء کے اصل فارسی قلمی نسخے میں باباصاحب کا سالِ وصال کیا لکھا گیا ہے؟ تاہم خزینۃ الاصفیاء کے مذکورہ بالا اردو ترجمے کے مطابق، خزینۃ الاصفیاء کے مصنف کی رائے میں باباصاحب کا سالِ وصال ۶۶۷ھ ہے نہ ۶۷۰ھ، بلکہ ۶۹۰ھ ہے۔

(۷) ۶۶۸ھ

اس کا ذکر مندرجہ ذیل تین کتابوں میں ملتا ہے:

(i) شیخ عبدالرحمٰن چشتی کی 'مرآۃ الاسرار' کا اردو ترجمہ

(ii) ابوالفضل کے 'آئینِ اکبری' کا اردو ترجمہ

(iii) کپتان واحد بخش سیال کی سوانح 'مقامِ گنج شکر'

موخر الذکر کتاب کے الفاظ میں ''ہمارے شجرہ شریف میں حضرت اقدس کا سن (سنہ) وصال ۶۶۸ھ ہے جو کشفی معلوم ہوتا ہے اور اصح (اصح) ہے۔'' واضح رہے کہ اس سے پہلے وحید احمد مسعود فریدی مرحوم بھی خواجہ نظام الدین اولیاء کی ''تقویت'' پر ہی ایک مختلف سنہ یعنی ۶۶۱ھ کو بابا صاحب کا سالِ وصال قرار دے چکے ہیں۔ ہم کشفی معاملات پر کچھ نہیں کہیں گے، تاہم بابا صاحب کے عاشقِ صادق اور سب سے چہیتے خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاء نے، بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں، ساری دنیا کی جو رہنمائی کی ہے، وہ اس کشف سے مختلف ہے اور ہم بابا صاحب کے بارے میں وہی بات درست مانیں گے جو خواجہ صاحب نے کہی ہو، بشرطیکہ اس بات کی تصدیق ہو جائے کہ یہ بات واقعی خواجہ صاحب ہی نے کہی ہے۔

(۸) ۶۶۹ھ

اس کا ذکر صرف ایک کتاب یعنی 'مرآۃ الاسرار' میں ان الفاظ میں ہے:

''دوسری روایت کے مطابق بابا صاحب نے ۶۶۹ھ میں وفات پائی۔''

(۹) ۶۷۰ھ

اس کا ذکر آٹھ کتابوں میں پایا، یا ان میں بتایا جاتا ہے، اور یہ کتابیں یا تو صدی / صدیوں پہلے لکھی گئیں، یا اس سالِ وصال کا ذکر ان حضرات کے قلم سے ہوا جن میں سے بیشتر علم و تحقیق میں مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں۔ نام یہ ہیں:

(i) مخبر الواصلین' جو شاہ جہاں کے عہد (۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء) میں، ۱۶۳۰ء میں، شروع ہوئی، مؤلف ابو عبداللہ محمد فاضل ہیں۔

(ii) 'خزینۃ الاصفیاء' جس کا ذکر نمبر شمار (۶) پر ابھی گزر چکا ہے۔

(iii) 'تذکرۃ العاشقین': ہمارے سامنے اس کتاب کا نسخہ نہیں، تاہم

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مطابق، جوانہوں نے خزینۃ الاصفیاء کے حوالے سے لکھا ہے، اس کتاب میں بھی بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ھ درج بتایا جاتا ہے۔ یہی بات طالب ہاشمی اور وحید احمد مسعود فریدی مرحوم نے بھی کہی ہے۔

(iv) 'سلسلہ الاولیاء': طالب ہاشمی لکھتے ہیں کہ مولوی محمد صالح کنجاہی نے ''سلسلہ الاولیاء'' میں مرزا مظہر جان جاناں کا ایک تاریخی قطعہ لکھا ہے جس سے بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ھ نکلتا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

فرید الدین کہ او گنجِ شکر بود
چو در ذاتِ خدا شد محوِ مطلق
بمظہر گفت ہاتف سالِ نقلش
فرید الدین ولی واصلِ حق

(v) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب 'تاریخِ دعوت وعزیمت'

(حصہ سویم)۔۱۹۶۲ء

(vi) پنجاب یونیورسٹی لاہور کی دائرۂ معارفِ اسلامیہ

(جلد نمبر ۱۵)۔۱۹۷۵ء

(vii) ڈاکٹر اسلم فرخی ''فرمایا خواجہ گنج شکرؒ نے'' ......۲۰۰۱ء میں دو اڈیشن آئے۔

(viii) محمد اجمل چشتی فاروقی ''چلہ گاہیں'' ۲۰۰۳ء

(۱۰) ۶۷۹ھ

اس کا ذکر صرف ایک کتاب میں ہے۔ کتاب پنجابی زبان میں ہے۔ نام ہے: ''آکھیا بابا فرید نے''۔ مصنف محمد آصف خان ہیں۔ کتاب کا موضوع بابا صاحب سے منسوب پنجابی شاعری ہے۔ کتاب میں بابا صاحب کے سالہائے ولادت اور وفات

کے بارے میں بھی ۱۴ صفحات پر مشتمل ایک مختصر، جامع اور معلوماتی نوٹ ہے۔ جس میں آصف خان اس غلط نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بابا صاحب کا وصال ۶۷۹ھ میں ہوا۔ غلط نتیجے کی دو وجوہات ہیں:

(الف) غلط مفروضے (ب) غلط طرزِ استدلال۔

(۱۱) ۶۸۰ھ

اس کا ذکر صرف ایک کتاب میں ہے۔ 'افضل الفوائد' کا حوالہ دیتے ہوئے، جو "آکھیا بابا فرید نے" کے فاضل مصنف نے امیر خسرو سے منسوب کی ہے، 'آکھیا بابا فرید نے' نامی کتاب میں کہا گیا ہے کہ 'افضل الفوائد' میں درج امیر خسرو کے مندرجہ ذیل تاریخی قطعے کے مطابق بابا صاحب کی تاریخِ وفات (۶۷۹ھ نہیں، بلکہ) ۶۸۰ھ نکلتی ہے:

شدہ تاریخِ نقلِ او بہ یقین
عمدہ دینِ حق فرید الدین (۶۸۰ھ)

(۱۲) ۶۸۷ھ

اس کا ذکر صرف ایک کتاب میں ہے۔ وحید احمد مسعود فریدی مرحوم کی کتاب میں لکھا ہے کہ 'راحت القلوب' میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۸۷ھ درج ہے۔

(۱۳) ۶۹۰ھ

اس سنہ کی روایت دو حوالوں سے ہے: اولاً "سیر الاقطاب" اور دوسرے مصطفائی بیگم جن کا نام ہمارے لیے ناآشنا ہے۔

مندرجہ ذیل چار فاضل سوانح نگاروں کے مطابق 'سیر الاقطاب' میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۹۰ھ درج ہے:

(i) مفتی غلام سرور لاہوری مصنف 'خزینۃ الاصفیاء' (جن کی کتاب کے

حوالے سے ہی بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۶۷ھ اور ۶۷۰ھ بھی بتایا جا چکا ہے)

(ii) طالب ہاشمی

(iii) وحید احمد مسعود فریدی مرحوم

(iv) محمد آصف خان، مصنف 'آکھیا بابا فرید نے'

اس سنہ کی روایت کا دوسرا حوالہ بھی 'آکھیا بابا فرید نے' نامی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹ پر درج ہے جس کے مطابق مصطفائی بیگم نے ان الفاظ میں بابا صاحب کا سالِ وصال نکالا ہے: ''مخدوم راہیں''

(۱۴) ۷۶۰ھ

گو اس سنہ کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں، تاہم اس بارے میں بھی کوئی شک نہیں کہ ۷۶۰ھ کے بابا صاحب کے سالِ وصال ہونے کی صریحاً غلط روایت 'تاریخِ فرشتہ' میں، ہندسوں اور عربی الفاظ، دونوں میں ۷۶۰ھ ہی تحریر ہے۔

ان چودہ مختلف روایات اور سالہائے وصال کو جانچنے کے لیے ہمارے پاس تین کسوٹیاں ہیں:

(۱) بلبن (فروری) ۱۲۶۶ء میں سلطان بنا۔ یکم جنوری ۱۲۶۶ء کو ۲۲ ربیع الاول ۶۶۴ھ تھی۔ وہ روایات جن میں بابا صاحب کا سالِ وصال اس تاریخ سے بھی پہلے بتایا گیا ہے، درست نہیں ہوں گی۔

(۲) بلبن کا عہدِ سلطانی ۱۲۶۶ء سے ۱۲۸۶ء تک ہے۔ بابا صاحب کا وصال بلبن کے ۲۰ سالہ عہد کے ابتدائی دور میں ہوا۔ وہ روایات جن میں بابا صاحب کا سالِ وصال اس عہد کے وسطی یا آخری حصے میں بتایا گیا ہے، درست نہیں ہوں گی۔

(۳) بابا صاحب کے وصال سے تین ماہ پہلے جو ماہِ رمضان آیا، وہ پاک پتن میں

خربوزوں کا موسم تھا۔ خربوزوں کی فصل عام طور پر بکرمی کیلنڈر کے پہلے مہینے یعنی بیساکھ میں ہوتی تھی اور یہ مہینا عیسوی تقویم کے مطابق وسط اپریل سے وسط مئی کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ روایات جن میں بابا صاحب کا سالِ وصال ایسے سنین میں دکھایا گیا ہے جن میں ماہِ رمضان وسط اپریل سے کئی ماہ پہلے، یا وسط مئی کے کئی ماہ بعد آیا ہے، درست نہیں ہوں گی۔

اس جانچ پڑتال کو سہل بنانے کے لیے، درج ذیل سطور میں دو جدولیں دی جا رہی ہیں۔۔ پہلی جدول میں جو (رمضان) ۶۶۳ھ سے (رمضان) ۶۷۲ھ (مطابق جون ۱۲۶۵ء سے اپریل ۱۲۷۴ء تک) دس برسوں پر محیط ہے، اولاً یہ بتایا گیا ہے کہ اس عشرے میں ماہِ رمضان کے دوران عیسوی سنین کی تاریخیں کیا تھیں؟ اور ثانیاً یہ کہ ان دس عیسوی سنین کے دوران، سولہ اپریل سے تیس اپریل تک کتنے روزے آئے اور اس کے بعد یکم مئی سے پندرہ مئی تک کتنے روزے آئے؟ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ رمضان ۶۷۲ھ (مطابق مارچ۔ اپریل ۱۲۷۴ء) تک کا عرصہ بلبن کے ۲۰ سالہ دورِ سلطانی (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۶ء) کے پہلے آٹھ برس (۱۲۶۶ء تا ۱۲۷۴ء) پر محیط ہے۔ آٹھ برس سے زیادہ عرصے کو بلبن کے عہدِ سلطانی کا ابتدائی دور کہنا لفظ 'ابتدائی' کے ساتھ زیادتی ہوگی، گو آٹھ بھی کچھ زیادہ ہی لگتا ہے۔

دوسری جدول یکم رمضان ۶۶۲ھ سے تیس رمضان ۶۷۲ھ تک (مطابق ۲۷ جون ۱۲۶۴ء تا ۹/ اپریل ۱۲۷۴ء) ہے اور گیارہ برسوں پر محیط ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ان گیارہ ہجری سنین کے دوران ۵ محرم کو سنہ عیسوی کی کیا تاریخ تھی؟ کیا دن تھا؟ اور دوسرے یہ کہ ان گیارہ برسوں میں، ۵ محرم سے تین ماہ قبل، رمضان کا مہینا عیسوی کیلنڈر کی کن تاریخوں میں آیا؟

پہلی جدول سے یہ عیاں ہے کہ اس عشرے میں صرف چھے قمری سنین ایسے

ہیں جن میں خربوزوں کا موسم رمضان کے مہینے میں آیا۔ یہ چھے قمری سنین ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰ اور ۶۷۱ ھ ہیں ۔ ۶۶۶ ھ میں رمضان کا صرف ایک روزہ تھا اور ۶۶۹ ھ میں رمضان کا تقریباً پورا مہینا (۲۷ روزے) خربوزوں کا موسم رہا۔ یہاں نوٹ کرنے والی دوسری بات یہ ہے کہ رمضان ۶۶۹ ھ ۱۲ مئی ۱۲۷۱ء کو ختم ہوتا ہے۔ اس کے تین ماہ بعد، ۵ محرم ۶۷۰ ھ (وسط اگست ۱۲۷۱ء) کو بلبن کو سلطان بنے تقریباً ساڑھے پانچ برس ہو گئے تھے۔ اس طرح یہ بلبن کے بیس سالہ عہد کا ابتدائی دور کہلائے گا۔ اس دور میں پاک پتن میں خربوزوں کا جو بھرپور موسم تھا، وہی بلبن کے عہد کا ابتدائی دور تھا۔ اب ایک بھرپور نظر جدولوں پر:

دیکھیے ''پہلی جدول'' (C)

دیکھیے ''دوسری جدول'' (D)

اب ہم اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں جہاں مختلف روایات میں درج بابا صاحب کے سالہائے وصال پر اپنے تبصرے دے سکیں۔

● (۵ محرم) ۶۶۰ ھ

اس سنہ کا ذکر مندرجہ بالا دونوں جدولوں میں اس لیے نہیں کیا گیا کیوں کہ یہ سنہ ''تاریخِ فرشتہ'' سے (غلط طور پر) منسوب تو ضرور کیا گیا ہے لیکن تاریخِ فرشتہ میں درج نہیں۔ اگر تاریخِ فرشتہ میں درج بھی ہوتا تو ان رہنما اصولوں کی روشنی میں درست قرار نہ پاتا جو اوپر دیے گئے ہیں۔ اولاً (۵ محرم) ۶۶۰ ھ، ۲۲ ربیع الاول ۶۶۴ ھ سے

چار برس پہلے آتا ہے؛ ثانیاً (۵ محرم) ۶۶۰ھ سے پہلے جو ماہ رمضان آیا، وہ ۶۵۹ھ میں تھا جو عیسوی سنہ کے مطابق ۳۰ جولائی تا ۲۹ راگست ۱۲۶۱ء تھے۔ اگست میں نہ صرف خربوزوں کا موسم کبھی کا گزر چکا ہوتا ہے بلکہ اگست کے آخر میں تو آموں کے موسم کا بھی چل چلاؤ ہوتا ہے۔

رہ گئے ان دو کتابوں اور سوانح نگاروں کے نام جنہوں نے ۶۶۰ھ کو 'تاریخِ فرشتہ' سے (غلط طور پر) منسوب کیا ہے، ان کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

(I) تذکرہ حضرت بابا فرید گنج شکر مصنف: طالب ہاشمی
ناشر: شعاع ادب، مسلم مسجد لاہور سالِ اشاعت: نہیں دیا

صفحہ نمبر: ۱۷۴

"حضرت بابا صاحب نے، با اختلافِ روایت، ۶۷ سے ۱۰۷ برس کے درمیان عمر پائی۔ آپ کے سالِ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں سخت اختلاف ہے۔ تاریخِ فرشتہ میں ۶۶۰ھ۔ سیر الاولیاء، سفینۃ الاولیاء، اخبار الاخیار اور جواہرِ فریدی میں شب سہ شنبہ (منگل) ۵ محرم ۶۶۴ھ۔ سیر الاقطاب میں ۶۹۰ھ۔ 'خزینۃ الاصفیاء' و 'سلسلہ الاولیاء' میں، چہارشنبہ (بدھ) ۵ محرم الحرام ۶۷۰ھ، اور آئینِ اکبری میں ۶۶۸ھ درج ہے۔ مولوی محمد صالح کنجاہی نے 'سلسلۂ الاولیاء' میں مرزا مظہر جان جاناں کا ایک تاریخی قطعہ درج کیا ہے جس سے ۶۷۰ھ تاریخ نکلتی ہے۔"

واضح رہے کہ ۵ محرم ۶۶۴ھ کو منگل نہیں بلکہ ہفتے کا دن تھا۔

(II) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ مصنف: وحید احمد مسعود فریدی

پہلا اڈیشن ۱۹۶۵ء دوسرا اڈیشن ۱۹۹۶ء

ناشر (پہلا اڈیشن): پاک اکیڈمی، وحید آباد کراچی

ناشر (دوسرا اڈیشن): ضیاء القرآن پبلی کیشنز، داتا گنج بخش روڈ، لاہور

(i) صفحہ نمبر ۱۸ (دونوں اڈیشنوں میں):

''میں نے حضرت سلطان المشائخ کی تقویت پر سالِ وصال ۶۶۱ھ لکھا ہے۔''

(ii) صفحہ نمبر ۱۸۱ (دونوں اڈیشنوں میں):

''آخری شب: ۵ محرم ۶۶۱ھ ۱۲۶۲ء''

صفحات نمبر ۱۸۱ اور ۱۸۲ کے زیریں حاشیے میں تحریر ہے:

سالِ وصال کے متعلق مختلف تذکرے مختلف البیان ہیں، ملاحظہ ہو:

(۱)	سیر الاقطاب	۶۹۰ھ
(۲)	راحت القلوب	۶۸۷ھ
(۳)	خزینۃ الاصفیاء	۶۷۰ھ
(۴)	جواہرِ فریدی	۶۶۴ھ
(۵)	سیر الاولیاء	۶۶۴ھ
(۶)	اخبار الاخیار	۶۶۴ھ
(۷)	سفینۃ الاولیاء	۶۶۴ھ
(۸)	فرشتہ	۶۶۰ھ

● ٦٦١ ھ

اس کے واحد راوی وحید احمد مسعود فریدی مرحوم کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ یہ سالِ وصال درست نہیں ہو سکتا اور اس پر اوپر تبصرہ ہو چکا ہے۔

● ٦٦٣ ھ

(III) فکر فرید — مصنف: سلیم یزدانی

ناشر: ڈینز پبلی کیشنز 3/I/D جیکب لائنز کراچی — سالِ اشاعت: ۱۹۸۵ء

صفحہ نمبر ۱۱۶ پر تحریر ہے:

"حضرت بابا صاحب کا وصال ۵ محرم ٦٦٣ ھ کو ہوا۔ یہ واقعہ پنج شنبہ (جمعرات) کی رات کا ہے۔"

دوسری جدول کے مطابق، ۵ محرم ٦٦٣ ھ کو ۲۸/اکتوبر ۱۲٦۴ء تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، فاضل مصنف نے اس سنہ کی سند نہیں لکھی۔ ثانیاً تقویم کی رُو سے ۵ محرم ٦٦٣ ھ کو منگل تھا۔ ثالثاً یہ تاریخ اور سنہ، ۲۲ ربیع الاول ٦٦۴ ھ/ یکم جنوری ۱۲٦٦ء سے کم از کم ایک سال قبل ہے۔ رابعاً اگر سالِ وصال (۵ محرم) ٦٦٣ ھ ہوتا تو دوسری جدول کے مطابق ماہ رمضان (٦٦۲ ھ)، تین ماہ قبل، ۲۷ جون تا ۲٦ جولائی (۱۲٦۴ء) کے دوران آتا جب خربوزوں کا موسم ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

(IV) آکھیا بابا فرید نے — مصنف۔ محمد آصف خاں

ناشر: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور سالِ اشاعت: پہلا اڈیشن: ۱۹۷۸ء
دوسرا اڈیشن: ۱۹۸٦ء

محمد آصف خان اس سالِ وصال (٦٦٣ ھ) سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے

مطابق بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۹ ھ ہے جس کے بارے میں آصف خان صاحب کی اس تحریر سے متعلقہ اقتباس ہم، بعد میں، ۶۷۹ ھ کے تحت دیں گے۔ اس کتاب کے حوالے سے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اپنی مندرجہ بالا (پنجابی) کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹ پر آصف خان صاحب لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''مولوی نور احمد چشتی نے (تحقیقاتِ چشتی کے صفحہ نمبر ۲۲ پر) یہ قطعہ دیا ہے جس سے (بابا صاحب کا) سالِ وصال ۶۶۳ ھ نکلتا ہے:

بود ذاتش مخزن حبّ خدا گنج شکر
عقل سالِ نقل او فرمود ''محبوبِ خدا''
۶۶۳ ھ

چند سطور قبل یہ لکھا جا چکا ہے کہ ۶۶۳ ھ بابا صاحب کا سالِ وصال نہیں ہو سکتا اور اِس کی وجوہات بھی بتائی جا چکی ہیں۔

● ۶۶۴ ھ

اس مضمون کا پہلا اور دوسرا حصہ اسی سنہ کے بارے میں ہیں اور اب اس پر مزید تبصرے کی حاجت نہیں۔ یہ سنہ کسی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔

● ۶۶۵ ھ

(V) پیام گنج شکر مصنف: ڈاکٹر منظور ممتاز
ناشر: نذیر سنز، ۴۰ اے اردو بازار، لاہور سالِ اشاعت: ۱۹۹۹ء
صفحہ نمبر ۶۳ پر تحریر ہے:

"حضرت بابا جی کا وصال منگل ۴محرم ۶۶۵ھ کو آدھی رات کے

لگ بھگ ہوا اور تدفین ۵ محرم ۶۶۵ھ بروز بدھ ہوئی جو

۱۶/اکتوبر (سولہ اکتوبر) ۱۲۶۶ء تھی۔"

مندرجہ بالا تاریخ، بلبن کی تخت نشینی کے تقریباً ساڑھے سات ماہ بعد آتی ہے، تاہم یہ لکھنا ضروری ہے کہ گزشتہ صفحات میں دی گئی دوسری جدول کے مطابق ۵ محرم ۶۶۵ھ کو چھے (۶) اکتوبر تھی، سولہ (۱۶) اکتوبر نہیں۔ یہ مصنف کا نہیں بلکہ کاتب اور پروف خواں کا سہو لگتا ہے کیوں کہ اسی کتاب میں، اس سے پہلے، صفحہ نمبر ۳۰ پر، دو جگہ، یہ تاریخ صحیح طور پر، چھے (۶) اکتوبر ہی درج ہے۔ ۵ محرم ۶۶۵ھ (مطابق ۶/اکتوبر ۱۲۶۶ء) بلبن کے عہدِ سلطانی کے ابتدائی دور میں وقوع ہونے والی پانچ محرم کی اولیں تاریخ ہے۔ اس طرح وہ اس رہنما اصول، یا کسوٹی، پر تو یقیناً پوری اترتی ہے جس کا تعلق بلبن کی تخت نشینی سے ہے لیکن اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی جس کا تعلق خربوزوں کے موسم سے ہے۔ ۵ محرم ۶۶۵ھ سے تین ماہ قبل رمضان ۶۶۴ھ آیا اور پہلی جدول سے واضح ہے کہ رمضان ۶۶۴ھ، یعنی ۶ جون تا ۵ جولائی ۱۲۶۶ء کے درمیان خربوزوں کا موسم ختم اور آموں کا موسم شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ تاہم اس تاریخ کو رد کرنے کی اصل وجہ وہ حقائق ہیں جو اس مضمون کے چوتھے حصے میں بیان کیے جائیں گے۔

ڈاکٹر منظور ممتاز کے علاوہ کسی بھی اور قدیم، یا جدید سوانح نگار نے ۶۶۵ھ (مطابق ۱۲۶۶ء) کو بابا صاحب کا سالِ وصال نہیں بتایا اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس سالِ وصال کی تصنیف کے لیے (خصوصاً والی ملتان شیر خان کے حوالے سے) جو پُر پیچ طریق استدلال اختیار کیا ہے، اس کے لیے قارئین ان کی کتاب، خصوصاً اس کے صفحات ۱۶ تا ۶۳، پڑھ کر خود اپنی رائے قائم کریں۔

ڈاکٹر صاحب کے طرزِ استدلال اور اس سے نکلنے والے نتیجے میں سب سے

بڑا سقم یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مبنی ان حقائق اور واضح سنین کو یکسر نظر انداز کر دیا جن کا ذکر ہم اس کتابچے کے چوتھے حصے میں کریں گے۔ ڈاکٹر منظور ممتاز نے اپنی کتاب میں ان سنین اور ان حقائق کی تردید تو کجا ان پر تبصرہ تک نہیں کیا۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا۔ ڈاکٹر منظور ممتاز نہ صرف غلط نتیجے پر پہنچے، بلکہ پہنچے بھی ۱۹۹۹ء میں جب اس کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔

- (۶۶۶ھ اور ۶۶۷ھ)

(VI) اللہ کے سفیر مصنف: خان آصف

ناشر: اخبار جہاں پبلی کیشنز، آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

سالِ اشاعت: پہلا اڈیشن: ۱۹۹۷ء چوتھا اڈیشن: ۲۰۰۱ء

چوتھے اڈیشن کے صفحہ نمبر ۲۴۱ پر لکھا ہے:

(حضرت بابا فرید گنج شکر کی) تاریخِ وصال: ۶۶۶ھ

اس کے بعد صفحہ نمبر ۳۹۸ پر پھر درج ہے:

''حضرت بابا فرید ۶۶۶ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔''

فاضل مصنف نے مندرجہ بالا سالِ وصال کا ماخذ لکھا نہ سند۔ ان کی غیر موجودگی میں ہم صرف یہ تبصرہ کر سکتے ہیں کہ ۵ محرم ۶۶۶ھ (۲۶ ستمبر ۱۲۶۷ء) کو بلبن کو سلطان بنے ڈیڑھ برس ہوا تھا، اس طرح یہ تاریخ بلبن کے عہد کے ابتدائی دور سے تو تعلق رکھتی ہے، تاہم رمضان (۶۶۵ھ) اس سے تین ماہ قبل، ۲۶ مئی تا ۲۴ جون (۱۲۶۷ء) میں آیا تھا جب خربوزوں کی فصل ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ خان آصف مرحوم کے علاوہ، اس سنہ کا ذکر 'خزینۃ الاصفیاء' میں 'تاریخِ فرشتہ' سے منسوب کیا گیا ہے۔ تاریخِ فرشتہ میں بابا صاحب کا سالِ وصال نہ ۶۶۶ھ لکھا ہے جو تاریخ کی اس کتاب

سے غلط منسوب کیا گیا ہے اور نہ ۶۶۰ھ جو اس سے پھر غلط منسوب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے، تاریخِ فرشتہ میں تو اعداد اور الفاظ دونوں میں ۶۰ ۷ھ لکھا گیا ہے جو بدیہی طور پر غلط ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر تاریخِ فرشتہ سے منسوب سنہ ان معنوں میں صحیح ہوتا کہ تاریخِ فرشتہ میں یہی لکھا ہے تو بھی وہ سنہ تاریخی طور پر غلط ہوتا اور یہاں تو تاریخِ فرشتہ سے جو سنہ منسوب کیا گیا ہے وہ ان معنوں میں بھی غلط ہے کہ یہ تاریخِ فرشتہ میں سرے سے درج ہی نہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جو سنہ درج ہے وہ بھی بدیہی طور پر غلط ہے۔

(VII) ''خزینۃ الاصفیاء'' مصنف: مفتی غلام سرور لاہوری

مترجم: اقبال احمد فاروقی ناشر مکتبۂ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور

سالِ تالیف: ۱۸۶۴ء	سالِ طباعت: فارسی اڈیشن: ۱۸۷۳ء	اردو ترجمہ: ۱۹۹۰ء
۱۲۸۱ھ	۱۲۹۰ھ	

ترجمے کے صفحہ نمبر ۱۳۶ پر تحریر ہے:

''حضرت خواجہ فرید شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ کی وفات 'اخبار الاخیار' اور 'سفینۃ الاولیاء' میں پانچ محرم ۶۶۴ھ بروز منگل لکھی ہے مگر تواریخِ فرشتہ میں ۶۶۶ھ، مخبر الواصلین اور تذکرۃ العاشقین کے علاوہ شجرہ چشتیہ میں معتبر اقوال کے ساتھ ۶۶۷ھ لکھا ہے۔ سیر الاقطاب کے مصنف نے ۶۹۰ھ لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی بات قابلِ تسلیم ہے۔''

گویا ''خزینۃ الاصفیاء'' کے اس ترجمے کے مطابق بابا صاحب کا سالِ وصال

۶۶۶ ھ ہے نہ ۶۶۷ ھ، اور ۶۷۰ ھ کا تو ذکر ہی نہیں، بلکہ یہ ۶۹۰ ھ (مطابق ۱۲۹۱ء) ہے، جب بلبن کو تخت نشین ہوئے نہیں، بلکہ مرے ہوئے پانچ برس گزر چکے تھے اور جو اس وجہ سے تاریخی طور پر غلط سالِ وصال ہو جاتا ہے۔

ہم گزشتہ صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ طالب ہاشمی صاحب اور وحید احمد مسعود فریدی مرحوم نے اپنی کتابوں میں، واضح طور پر، لکھا ہے کہ 'خزینۃ الاصفیاء' میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ ھ بتایا گیا ہے، اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مرحوم نے تو اس فقرے کا حوالہ دے کر، جو ہم نے 'خزینۃ الاصفیاء' کے صفحہ نمبر ۱۳۶ سے اوپر نقل کیا ہے، یہ لکھا ہے کہ 'خزینۃ الاصفیاء' میں، بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین، بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ ھ درج ہے۔ اگر تین مختلف صاحبانِ قلم، جن میں مولانا ندوی مرحوم جیسا جید عالم بھی شامل ہو، قرنوں پہلے، یہ کہیں کہ 'خزینۃ الاصفیاء' میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ ھ لکھا ہے، اور ہمارے سامنے اس کتاب کا ۱۹۹۰ء کا جو ترجمہ ہو، اس میں ۶۷۰ ھ کا ذکر ہی نہ ہو، تو اس امکان کو رَد نہیں کیا جا سکتا کہ اس اردو ترجمے میں، جو ۱۹۹۰ء میں طبع ہوا ہے، کتابت کی وہ غلطی ہوگئی ہو جو پہلے ترجمے میں نہ ہو۔ یاد رہے کہ 'اخبار الاخیار' کے ۱۹۹۷ء کے مترجم، یا اشاعتی ادارے نے، کتاب کے اس اردو ترجمے میں، بابا صاحب کی عمر قوسین میں (۵۹) برس لکھ کر جو غلطی کی، وہ ہم اس مضمون کے پہلے حصے میں نمبر شمار ix پر دیکھ آئے ہیں۔ ۱۹۹۷ء کی طرح، ۱۹۹۰ء کے اردو ترجمے میں بھی غلطی ہو سکتی ہے۔

دوسری جدول کے مطابق ۵ محرم ۶۶۷ ھ کو ۱۴ ستمبر ۱۲۶۸ء تھا۔ بلبن کو سلطان بنے تقریباً ڈھائی برس ہو گئے تھے جو بلبن کے عہد کا ابتدائی دور کہلائے گا۔ ۵ محرم ۶۶۷ ھ سے قبل، رمضان (۶۶۶ ھ) ۱۵ مئی تا ۱۳ جون ۱۲۶۸ء میں آیا جب خربوزوں کا موسم تقریباً گزر چکا ہوتا ہے۔ پہلی جدول کے مطابق اس موسم کے دوران رمضان کا

صرف ایک روزہ بتاریخ ۱۵ مئی ۱۲۶۸ء آیا۔

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ۶۶۷ ھ کا ذکر 'خزینۃ الاصفیاء' کے صحیح نسخے میں ہونا مشکوک ہے اور اس سنہ کا ذکر اگر یہاں نہیں تو اس کے علاوہ کہیں بھی نہیں۔ لیکن اس سنہ کو رد کرنے کی اصل وجہ وہ ہے جو اس کتاب کے چوتھے حصے میں بیان کی جائے گی۔ اور یہ نہ صرف اس سنہ (۶۶۷ ھ) کو رَد کرنے کی اصل وجہ ہے بلکہ اس کے علاوہ دیگر بہت سے سنینِ وصال کی روایتوں کو رَد کرنے کی اصل (اور ٹھوس) وجہ بھی یہی ہے۔

● ۶۶۸ ھ

اب ہم ان تین کتابوں کا ذکر قدرے تفصیلاً کرتے ہیں جن میں ۶۶۸ ھ کو باباصاحب کا سالِ وصال قرار دیا گیا ہے۔

(VIII) مرآۃ الاسرار مؤلف: شیخ عبدالرحمٰن چشتی (۱۰۰۰ ھ تا ۱۰۹۴ ھ)

سالِ اشاعت: نہیں دیا مترجم: کپتان واحد بخش سیال

ترجمے کے ناشر: الفیصل اردو بازار لاہور

صفحہ نمبر: ۱۷۷

"آپ (بابا فرید) کی وفات سہ شنبہ (منگل) کے دن پانچویں محرم ۶۶۸ ھ اور دوسری روایت کے مطابق ۶۶۹ ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوئی۔"

دوسری جدول D کے مطابق ۵ محرم ۶۶۸ ھ کو بدھ کا دن تھا، منگل کا نہیں۔

دوسری روایت پر تبصرہ، ۶۶۹ ھ کے تحت، آگے درج ہے۔

(IX) آئین اکبری مصنف: ابوالفضل

مترجم: محمد فدا علی طالب سالِ اشاعت: نہیں دیا

ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور

جلد دوئم کے صفحہ نمبر ۳۲۹ پر لکھا ہے:

"(شیخ فرید گنج شکر نے) روز شنبہ (ہفتہ) پانچویں محرم ۶۶۸ھ، پٹن (پنجاب) میں جو اس وقت اجودھن کے نام سے مشہور تھا، اس دارِ ناپائدار سے رحلت فرمائی۔"

دوسری جدول کے مطابق ۵ محرم ۶۶۸ھ کو بدھ کا دن تھا۔ ہفتے کے دن کا ذکر روایت کی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

(X) مقام گنج شکر مصنف: کپتان واحد بخش سیال

ناشر: پہلا اڈیشن: ۱۹۷۹ء۔ بختیار پرنٹرز، دربار مارکیٹ، گنج بخش روڈ، لاہور

دوسرا اڈیشن: ۱۹۸۸ء۔ بزم اتحاد المسلمین، لاہور۔

پہلے اڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۳۰، اور دوسرے اڈیشن کے صفحات نمبر ۱۴۱ اور ۱۴۲ پر درج ہے:

"حضرت بابا فرید الدین مسعود کا .... سن (سنہ) وصال سیر الاولیاء کے مطابق ۶۶۴ھ ہے لیکن ہمارے شجرہ شریف میں حضرت اقدس کا سن (سنہ) وصال ۶۶۸ھ ہے جو کشفی معلوم ہوتا ہے اور اصح (اصح) ہے۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ سیر الاولیاء میں بابا صاحب کا سنہِ وصال ۶۶۴ھ نہیں لکھا گیا بلکہ سیر الاولیاء کے (غلط) حوالے سے یہ سنہ مدتوں سے بابا صاحب کا سنہِ وصال

بتایا، یا سمجھا، جاتا رہا ہے۔ دوسری بات یعنی سالِ وصال کے کشفی ہونے کے بارے میں، ہم اپنی رائے کا اظہار پہلے کر چکے ہیں۔

دوسری جدول (D) کے مطابق ۵ محرم ۶۶۸ھ کو ۴ ستمبر ۱۲۶۹ء تھا۔ بلبن کو سلطان بنے تقریباً ساڑھے تین برس ہو چکے تھے جو اس کے عہد کا ابتدائی دور کہلائے گا۔ ۵ محرم ۶۶۸ھ سے تین ماہ قبل، رمضان (۶۶۷ھ) ۴ مئی تا ۲ جون (۱۲۶۹ء) میں آیا اور اس دوران تقریباً بارہ روزوں میں خربوزوں کا موسم تھا جو پہلی جدول (C) میں بتایا گیا ہے۔ اس طرح یہ سنہ دونوں کسوٹیوں پر پورا اترتا ہے۔

اگر ہمارے پاس وہ قابلِ احترام تصدیق شدہ شہادتیں نہ ہوتیں جن کا ذکر اس کتاب کے چوتھے حصے میں آئے گا، تو ہمارے لیے ۶۶۸ھ (مطابق ۱۲۶۹ء) کو باباصاحب کے ایک انتہائی ممکنہ سالِ وصال کے طور پر رَد کرنا خاصا مشکل ہوتا کیوں کہ اولاً یہ سنہ بلبن کے عہد کے ابتدائی دور میں ہے۔ ثانیاً اس سے تین ماہ قبل رمضان کے بارہ روزے خربوزوں کے موسم میں آئے۔ ثالثاً اس کا راوی ایک نہیں، دو ہیں اور قابلِ اعتبار ہیں؛ گو دونوں روایتوں میں دو ایسے مختلف دنوں (منگل اور ہفتہ) کا ذکر جو تقویم کے مطابق نہیں ہے، دونوں روایتوں کو اس حد تک ضعیف بنا دیتا ہے۔

● ۶۶۹ھ

یہ سنہ صرف 'مرآۃ الاسرار' میں درج ہے اور وہ بھی روایت کے طور پر۔ یہاں دن کا بھی ذکر نہیں۔ 'مرآۃ الاسرار' میں دیئے ہوئے فقرے سے واضح ہے کہ شیخ عبدالرحمٰن چشتی خود بھی اس سنہ کو روایتاً بیان کر رہے ہیں۔ ان کا زور ۶۶۸ھ پر ہے۔

(XI) (i) مخبر الواصلین

مؤلف: ابوعبداللہ محمد فاضل بن سید احمد بن سید حسن الحسینی الترمذی اکبر آبادی (تخلص: مظہر الحق)

اس کی تالیف ۱۰۴۰ھ (مطابق ۱۶۳۰ء) میں شروع ہوئی جو شاہجہاں کے عہد کا آغاز تھا اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے آغاز میں ختم ہوئی۔ ایشیاٹک سوسائٹی، کول کتا کے میوزیم میں اس کا جو مخطوطہ ''Persian Society Collection-759'' کی درجہ بندی کے تحت محفوظ ہے، اس کی کتابت حیدر آباد دکن میں ۱۱۵۱ھ (مطابق ۱۷۳۸ء) میں مکمل ہوئی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب محمد شاہ رنگیلے کے دور میں نادر شاہ نے دہلی پر قبضہ کیا تھا۔ اس مخطوطے کے ورق نمبر ۶۰ (a) پر تحریر ہے:

تاریخِ رحلت: شیخ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ:

''فرید الدین ولی واصل حق' ۶۷۰ھ''

(ii) مخبر الواصلین — سالِ اشاعت: نہیں دیا

ناشر: کتب خانہ نذیریہ مسلم منزل، کھاری باؤلی، دہلی

اس مطبوعہ فارسی کتاب کے صفحہ نمبر ۵۷ پر بھی مندرجہ بالا عبارت ان ہی الفاظ میں درج ہے۔ دونوں میں کوئی تفاوت نہیں۔

یہ مصرع اس تاریخی قطعے کا آخری مصرع ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اپنی کتاب 'تذکرہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ' کے صفحہ نمبر ۱۷۴ پر طالب ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ مولوی محمد صالح کنجاہی نے 'سلسلہ الاولیاء' میں مرزا مظہر جان جاناں کا ایک تاریخی قطعہ درج کیا ہے جس سے ۶۷۰ھ تاریخ نکلتی ہے۔ محمد آصف خان نے

'آکھیا بابا فرید نے' کے صفحہ نمبر ۱۹ پر بھی وہی قطعہ درج کیا ہے جسے بیان مکمل کرنے کے لیے، ہم یہاں ایک بار پھر دہرا دیتے ہیں، اور ویسے بھی قطعہ اتنا خوب صورت ہے کہ دہرانے کو جی چاہتا ہے اور یاد رہے کہ اس قطعے کے خالق کا شمار ان ۲۲ عظیم صوفیہ میں ہے جن کی وجہ سے دلّی کو ۲۲ خواجاؤں کی چوکھٹ کہا جاتا ہے:

فرید الدین کہ او گنج شکر بود

چو در ذاتِ خدا شد محوِ مطلق

بمظہر گفت ہاتف سالِ نقلش

"فرید الدین ولی واصلِ حق"

(XII) تاریخِ دعوت و عزیمت (حصہ سویم) مصنف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سالِ تالیف: ۱۹۶۲ء سالِ اشاعت: درج نہیں

ناشر: مجلس نشریات اسلام، ۱۰. کے. تین، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد کراچی

صفحہ نمبر: ۴۵ (زیریں حاشیہ)

"صاحب سیرۃ الاولیاء نے متعدد مقامات پر ۶۶۹ ھ کے ایسے واقعات نقل کیے ہیں جو حضرت خواجہؒ (فرید الدین مسعود گنج شکر) کی زندگی سے متعلق ہیں۔ بعض مقامات پر حضرت خواجہ نظام الدین کی تحریر کا حوالہ ہے کہ حضرت خواجہ نے مجھ سے یہ فرمایا، فلاں ہدایت کی۔ اگر ان سنین کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو سنہِ وفات ۶۶۴ ھ جو عام طور پر مشہور اور زیادہ تر کتابوں میں مذکور ہے، مشکوک ہو جاتا ہے۔ اور ماننا پڑتا ہے کہ حضرت خواجہ کی وفات اس (۶۶۴ ھ) کے بعد ہوئی۔ بعض دوسری کتابوں

میں بعد کے سنین درج ہیں۔ان میں قرینِ قیاس ۶۷۰ ھ
ہے۔ جو خزینتہ الاصفیاء میں، بحوالہ مخبر الواصلین و
تذکرۃ العاشقین ، درج ہے۔''

غور کا مقام ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم نے، ۱۹۶۲ء یا اس کے لگ بھگ، وہی سیر الاولیاء اور دوسری کتب پڑھیں جو ۱۹۶۲ء سے پہلے، یا اس کے بعد، بابا صاحب کے دوسرے سوانح نگاروں نے پڑھیں۔ سب نے ۶۶۴ ھ کا ذکر بھی پڑھا اور ۶۶۹ ھ میں ہونے والے واقعات کا بھی۔ مولانا ندوی مرحوم اور ان دیگر حضرات میں فرق یہ ہے، اور یہ فرق 'اندرونی آنکھ' سے تعلق رکھتا ہے، کہ مولانا ندوی مرحوم یہ پڑھ کر، ۱۹۶۲ء یا اس سے پہلے، اِس قطعی نتیجے پر پہنچ گئے کہ بابا صاحب کی وفات ۶۶۴ ھ کے بعد ہوئی اور یہ نتیجہ نکالا کہ قرینِ قیاس سالِ وصال ۶۷۰ ھ ہے۔ اس کے برعکس دیگر حضرات نے یہی کتب اور یہی سنین پڑھ کر یہ متضاد نتیجہ نکالا کہ بابا صاحب کی وفات چونکہ ۶۶۴ ھ میں ہونا مسلمہ امر ہے، اس لیے ۶۶۹ ھ کا سنہ غلط لکھا گیا ہے۔ آنکھ کے ساتھ جب تک ''اندرونی آنکھ'' نہ ہو، شے کی حقیقت نظر نہیں آتی۔ بصارت کے ساتھ بصیرت لازمی ہے۔

ہم نے مولانا ندوی مرحوم کی کتاب سے جو اقتباس اوپر نقل کیا ہے، اس کے آخری فقرے کے بارے میں ہماری رائے، جس کا اظہار پہلے بھی کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ ''خزینتہ الاصفیاء'' کے ۱۹۹۰ء کے اردو ترجمے میں ۶۶۷ ھ کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے ورنہ مولانا ندوی مرحوم ۱۹۶۲ء کے لگ بھگ، وحید احمد مسعود فریدی مرحوم ۱۹۶۵ء میں اور طالب ہاشمی کسی نامعلوم برس میں یہ نہ لکھتے کہ ''خزینتہ الاصفیاء'' میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ ھ درج ہے۔

(XIII) اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد نمبر: ۱۵) پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹۷۵ء)

صفحہ نمبر ۳۳۹

"۔۔۔۔۔۔ اختلاف سنہ وفات میں بھی پایا جاتا ہے۔ (امیر خورد) کرمانی نے یہ تاریخ پانچ محرم ۶۶۴ھ/ سترہ اکتوبر ۱۲۶۵ء (دوشنبہ) دی ہے اور تاریخِ فرشتہ (بمبئی، ۲: ۳۹۰-۷) نے پانچ محرم ۶۷۰ھ/ تیرہ اگست ۱۲۷۱ء (پنج شنبہ) لکھی ہے۔ دیگر قرائن سے موخر الذکر تاریخِ وفات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ فرشتہ میں غالباً کتابت کی غلطی سے ۶۷۰ھ کی بجائے ۶۰۷ھ لکھا گیا ہے۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ امیر خورد کرمانی نے، سیر الاولیاء میں، بابا صاحب کی کوئی تاریخِ وفات سرے سے نہیں دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن صاحب نے بھی بعد میں سیر الاولیاء میں وہ وضاحتی، یا اضافی، حاشیہ آرائی کی ہے جس میں، فارسی زبان کے الفاظ میں، ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کا سالِ وصال لکھا گیا ہے، انہوں نے بھی صرف سنہ کا ذکر کیا ہے، دن کا نہیں، چنانچہ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ" میں اس حوالے سے دوشنبہ کا ذکر درست نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ دوسری جدول کے مطابق ۵ محرم ۶۶۴ھ کو ہفتے کا دن تھا جسے بعض سوانح نگاروں نے غلطی سے "منگل" لکھ ڈالا ہے اور پنجاب یونیورسٹی کی ۲۷ جلدوں پر مشتمل اس ۳۴ سالہ (۱۹۶۴ء تا ۱۹۹۷ء) علمی کاوش میں اسے "پیر" کا روز لکھ دیا گیا ہے۔ چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ تاریخِ فرشتہ میں (عربی) الفاظ اور اعداد، دونوں میں، ۶۰۷ھ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود پنجاب یونیورسٹی کی اس تاریخی علمی کاوش میں ۶۰۷ھ کو کتابت کی غلطی پر محمول کرنا عجیب سا لگتا ہے، اور اس کے بعد اس غلطی سے یہ غلط نتیجہ نکالنا کہ صحیح ہندسہ ۶۷۰ھ تھا، اس سے بھی زیادہ عجیب لگتا ہے۔

(XIV) فرمایا خواجہ گنج شکرؒ نے — مصنف: ڈاکٹر اسلم فرخی

پہلا اڈیشن: ۲۰۰۱ء — دوسرا اڈیشن: ۲۰۰۱ء

ناشر: شہرزاد، بی ۱۵۵/۵، گلشن اقبال، کراچی

اردو کے جانے پہچانے ادیب، معلم اور اولیائے کرام، خصوصاً خواجہ نظام الدین اولیاء، پر کئی کتب اور کتابچوں کے مصنف پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی مندرجہ بالا کتابچے کے دوسرے اڈیشن کے صفحہ نمبر ۲۴ پر لکھتے ہیں:

''(بابا صاحب کے) سالِ وفات میں اختلاف ہے۔ ۶۶۴ھ یا ۶۷۰ھ۔ امیر خورد (کرمانی) نے ''سیر الاولیاء'' میں لکھا ہے کہ شیخؒ نے حضرت محبوبِ الٰہی کو خلافت نامہ بدھ، تیرہ رمضان ۶۶۹ھ کو عطا فرمایا تھا۔ اس بیان کی رُو سے ۶۷۰ھ صحیح سالِ وفات قرار پاتا ہے۔''

(XV) چلہ گاہیں — مصنف: محمد اجمل چشتی فاروقی

صفحات نمبر ۸۳ اور ۸۸ — سال اشاعت: ۲۰۰۳ء

ناشر: مرکز تعلیمات چشتیہ، فرید منزل، چشتیاں، ضلع بہاول نگر

(i) صفحہ نمبر ۸۳

''شیخ العالم حضرت بابا صاحبؒ کا سن (سنہ) وصال معتبر و مستند واقعات کی روشنی میں ۵ محرم الحرام ۶۷۰ھ ہے اور ۵ محرم ۶۶۴ھ سن (سنہ) وصال غلط العام ہو گیا ہے۔''

(ii) صفحہ نمبر ۸۸

''تاریخ اور ملفوظات کی بہت سی کتابوں میں حضرت بابا صاحبؒ کا سن (سنہ) وصال ۵ محرم ۶۷۰ھ واضح اور نا قابلِ تردید ہے۔''

اوپر نمبر شمار IV پر، ہم نے محمد آصف خان کی کتاب "آکھیا بابا فرید نے" کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کے مطابق بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۹ھ ہے اور یہ بھی لکھا تھا کہ ان کی اس تحریر سے اقتباس، بعد میں، سنہ ۶۷۹ھ کے تحت دیا جائے گا۔ اب یہ اقتباس پیش ہے۔ کتاب کے دوسرے اڈیشن کے صفحہ نمبر ۲۵ سے متعلقہ اقتباس کا رواں اردو ترجمہ یہ ہے:

"فرشتہ کے علاوہ، بیشتر مصنفین اس پر متفق ہیں کہ بابا فرید، "منگل، ۵ محرم"، کو وفات پا گئے۔ اب اگر ہم اس برس کا تعین کر سکیں جس میں یہ دن اور تاریخ ایک ساتھ آئے تو بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔۔۔۔۔ ۶۷۹ھ میں، ۵ محرم اور منگل ایک ساتھ تھے۔ یہی وہ تاریخ ہے جب بابا فرید اپنے رب سے جا ملے۔ انگریزی تقویم کے مطابق یہ ۷ مئی ۱۲۸۰ء، منگل تھا۔"

بابا صاحب کے سالِ وصال کے تعین کے لیے آصف خان صاحب نے جو راہ اختیار کی وہ سہل تو تھی لیکن صحیح نہیں چنانچہ وہ یکسر غلط مفروضوں میں گرفتار ہو کر بدیہی غلطیوں کا شکار ہوئے اور بالکل غلط نتیجے پر پہنچے۔

پہلے تو یہ مفروضہ درست نہیں کہ بابا صاحب کا وصال منگل کے روز ہوا۔ سیر الاولیاء کے جس وضاحتی، یا اضافی، حاشیے کا ذکر ہم نے اس مضمون کے دوسرے حصے میں کیا تھا، اس تک میں کسی دن کا ذکر نہیں۔ بابا صاحب کے سالِ وصال کے تعین کے لیے ٹھوس داخلی اور خارجی حقائق کو بنیاد بنانے کی بجائے، کسی ایک دن (منگل) کو بنیاد بنا لینا اور اس پر سالِ وصال منطبق کر دینا تاریخ جوئی یا تاریخ نویسی کا درست طریقہ نہیں۔

دوسری بدیہی غلطی دوسری جدول پر ایک نظر ڈالتے ہی واضح ہو جائے گی۔
اگر بابا صاحب کے سالِ وصال کے تعین کا معیار یہی ٹھہرا کہ وہ کون سا برس تھا جس میں ایک مخصوص دن اور تاریخ ایک ساتھ آئے تو بھی دوسری جدول سے واضح ہوتا ہے کہ ۶۷۹ھ سے پورے آٹھ برس پہلے (۵ محرم) ۶۷۱ھ (مطابق ۲/ اگست ۱۲۷۲ء) کو یہ دن اور تاریخ ایک ساتھ آئے اور اس سے بھی پورے آٹھ برس پہلے یعنی (۵ محرم) ۶۶۳ھ (مطابق ۲۸/ اکتوبر ۱۲۶۴ء) کو بھی یہ دن اور تاریخ ایک ساتھ آئے۔ آصف خان صاحب نے ۶۶۳ھ اور ۶۷۱ھ کو نظر انداز کرنے کی وجہ نہیں بتائی۔ اگر ہم ان کی رضا کارانہ وکالت کرتے ہوئے یہ کہیں کہ انہوں نے ۶۶۳ھ کو اس لیے نظر انداز کیا ہوگا کہ یہ سنہ ۶۶۴ھ سے پہلے آتا ہے جو بابا صاحب کے سالِ وصال کے طور پر مشہور تھا، تب بھی ۶۷۱ھ کا ذکر ہی نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور ۶۷۱ھ چھوڑ کر ۶۷۹ھ پر جست مارنے کا کوئی جواز نہیں ملتا اور نہیں بنتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ بابا صاحب نے بلبن کے عہد کے ابتدائی دور میں وفات پائی۔ بلبن کا دورِ سلطانی ۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۶ء (مطابق ۶۶۴ھ تا ۶۸۵ھ) پر محیط ہے۔ اگر آصف خان صاحب ۶۷۱ھ (مطابق ۱۲۷۲ء) کو بابا صاحب کا سالِ وصال قرار دیتے تو بلبن کی تخت نشینی کے تقریباً سات سال بعد آنے والے اس سنہ ۶۷۱ھ کو کھینچ تان کر بلبن کے بیس سالہ عہد کا ابتدائی دور کہا جاسکتا تھا لیکن ۶۷۹ھ (مطابق ۱۲۸۰ء) تو بلبن کے عہد کا آخری دور کہلائے گا، ابتدائی دور نہیں۔ ۱۲۸۰ء کے چھے سال بعد تو بلبن کا انتقال ہو گیا تھا۔

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ (۵ محرم) ۶۷۹ھ سے تین ماہ پہلے جو ماہ رمضان (۶۷۸ھ) آیا اس میں روزے ۵ جنوری تا ۴ فروری ۱۲۸۰ء میں آئے۔ یہ پنجاب میں کڑاکے کی سردی کا موسم ہوتا ہے، خربوزوں کا نہیں۔ یہ سالِ وصال خارج

ازامکان ہے، اسی وجہ سے اس سال کا مندرجہ بالا دونوں جدولوں میں ذکر نہیں کیا گیا۔

- ۶۸۰ھ

اس کا ذکر صرف ایک جگہ ("آکھیا بابا فرید نے" کے صفحہ نمبر ۱۰) اور وہ بھی ایک (انتہائی ضعیف) حوالے یعنی امیر خسرو سے منسوب کی جانے والی کتاب ''افضل الفوائد'' میں کیا گیا ہے۔ ۶۷۹ھ کے بارے میں مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہی ۶۸۰ھ کے بارے میں بھی کہا جائے گا۔ یعنی یہ سالِ وصال خارج از امکان ہے اور ہماری دانست میں امیر خسرو کبھی ایسا تاریخی قطعہ نہیں کہہ سکتے جس سے بابا صاحب کے وصال کا ایسا سنہ نکلے جو خارج از امکان ہو۔

- ۶۸۷ھ

وحید احمد مسعود فریدی کی سوانح کے دونوں اڈیشنوں میں (جن کے کوائف اوپر دیئے جا چکے ہیں) صفحات نمبر ۱۸۱ اور ۱۸۲ کے زیریں حاشیوں میں لکھا گیا ہے کہ ''راحت القلوب'' میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۸۷ھ بتایا گیا ہے۔ سنہ ۶۷۹ھ اور ۶۸۰ھ کی طرح یہ سال اتنا بعید از قیاس ہے کہ اس کا ذکر پہلی جدول میں کیا گیا ہے، نہ دوسری جدول میں۔ ۵ محرم ۶۸۷ھ کو ۱۰ فروری ۱۲۸۸ء تھی۔ بلبن کے انتقال کو دو برس گزر چکے تھے۔ اس طرح یہ بلبن کے عہدِ سلطانی کا ابتدائی دور نہیں، بلکہ اس کے برعکس بلبن کی وفات کے بعد کا ابتدائی دور کہلائے گا۔

اس بارے میں دو مزید امور قابلِ غور ہیں۔ اولاً ''راحت القلوب'' کو بابا صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ بتایا جاتا ہے۔ بابا صاحب خود اپنے ملفوظات میں اپنا سالِ وصال کیسے بتا سکتے ہیں؟ ثانیاً بابا صاحب کے یہ ملفوظات، اس کتاب کے مطابق،

خواجہ نظام الدین اولیاء نے، ۲۴ مجلسوں میں، ۱۵ رجب ۶۵۵ھ سے ۲ ربیع الاول ۶۵۶ھ کے درمیان، ساڑھے سات ماہ کے دوران درج کیے۔ ان تاریخوں میں خواجہ صاحب آٹھ نو سال کے بچے اور بدایوں میں طفلِ مکتب تھے۔ اس وقت تک انہوں نے بابا صاحب کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ خواجہ صاحب پہلی بار جب بابا صاحب کی خدمت میں (۶۶۷ھ میں) حاضر ہوئے، اس وقت خواجہ صاحب کی عمر بیس برس تھی۔ راحت القلوب میں دی ہوئی جملہ چوبیس تاریخیں اس کسوٹی پر غلط ثابت ہوجاتی ہیں۔ جب چوبیس تاریخوں میں سے ایک تاریخ بھی درست نہیں، تو یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ ان تاریخوں میں لکھے ہوئے مندرجات کس حد تک قابلِ اعتبار ہوسکتے ہیں۔

● ۶۹۰ھ

(الف) مندرجہ ذیل کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ ''سیر الاقطاب'' میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۹۰ھ بتایا گیا ہے:

(۱) مفتی غلام سرور لاہوری کی کتاب ''خزینۃ الاصفیاء'' کے اردو ترجمے (۱۹۹۰ء) کے صفحہ نمبر ۱۳۶ پر

(۲) طالب ہاشمی کی کتاب ''تذکرہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ'' کے صفحہ نمبر ۴۷ پر

(۳) وحید احمد مسعود فریدی کی کتاب ''سوانح حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ'' کے دونوں اڈیشنوں کے صفحات نمبر ۱۸۱ اور ۱۸۲ کے زیریں حاشیوں میں۔

(۴) محمد آصف خان کی کتاب ''آکھیا بابا فرید نے'' کے صفحہ نمبر ۲۶ کے نمبر شمار (۶) پر جسے ان کی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۰ کے نمبر شمار (۳) سے ملا کر پڑھا جائے۔

(ب) اس کے علاوہ ''آکھیا بابا فرید نے'' کے صفحہ نمبر ۲۶ پر ہی، ایک کتاب ''تذکرہ خاصانِ خدا'' کے صفحہ نمبر ۱۹۷ کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ مصطفائی بیگم نے الفاظ ''مخدوم راہیں'' سے بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۹۰ھ نکالا ہے۔ مصطفائی بیگم کون ہیں؟ یہ نہیں بتایا گیا۔

۶۹۰ھ کا سالِ وصال ہونا اتنا ہی خارج از امکان ہے جتنا ۶۸۷ھ کا اور ان ہی وجوہات کی بنا پر۔ اس پر مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔

● ۶۷۰ھ

(XVI) تاریخِ فرشتہ — مصنف: محمد قاسم ہندوشاہ

ناشر: منشی نول کشور، لکھنؤ، بھارت — سالِ اشاعت: ۱۸۶۴ء

جلد دوئم کے صفحہ نمبر ۳۹۰ پر تحریر ہے:

''انگاہ سر بسجدہ گزاشت و درمیانِ سجدہ رحلت کرد، وایں واقعہ شبِ پنج شنبہ، پنجم ماہِ محرم سنہ ستین وسبعمایۃ (۶۷۰) رونمود؛'

ترجمہ: اس وقت (بابا صاحب نے) سر سجدے میں رکھا اور سجدے کے دوران رحلت فرما گئے۔ یہ واقعہ جمعرات کی شب، پانچ محرم، سات سو ساٹھ (ہجری) ۶۷۰ (ہجری) میں ہوا۔

۶۷۰ ہجری کو بابا صاحب کا سالِ وصال بتا کر تاریخِ فرشتہ نے تاریخ پر ظلم کیا ہے اور تاریخِ فرشتہ پر ظلم ان فاضل سوانح نگاروں نے کیا جن میں سے کسی (مثلاً طالب ہاشمی صاحب اور وحید احمد مسعود فریدی مرحوم) نے لکھا کہ تاریخِ فرشتہ کے مطابق بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۰ھ ہے، کسی (مثلاً خزینۃ الاصفیاء کے مصنف) نے لکھا کہ تاریخِ فرشتہ میں بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۶ھ درج ہے اور کسی (مثلاً پنجاب

یونیورسٹی) نے پہلے تو یہ لکھا کہ تاریخِ فرشتہ نے ''پانچ محرم ۶۷۰ھ / تیرہ اگست ۱۲۷۱ء (پنج شنبہ) لکھی ہے'' اور اس کے ایک سطر بعد یہ لکھ ڈالا کہ ''تاریخِ فرشتہ میں غالباً کتابت کی غلطی سے ۶۷۰ھ کی بجائے ۷۰۶ھ لکھا گیا ہے۔'' آیا یہ کتابت کی غلطی ہے؟ اس کا فیصلہ تاریخ فرشتہ کا مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر اب آپ خود کرلیں۔ تاریخِ فرشتہ کے اسی صفحہ نمبر ۳۹۰ پر سب سے حیرت انگیز اندارج یہ ہے کہ اسی صفحے (۳۹۰) پر صرف چند سطور کے بعد، جو نیچے درج کی جارہی ہیں، تاریخ فرشتہ جو کچھ بتاتی ہے، اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بابا صاحب ۶۶۹ھ میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے، اس کے بعد پورے اکیانوے (۹۱) برس زندہ رہے اور تقریباً ۹۳ برس کی عمر میں ۷۶۰ھ میں انتقال کر گئے، گویا وہ دو برس کی عمر میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے (اور ۹۱ برس تک مرض الموت میں مبتلا رہے)۔ تاریخِ فرشتہ کے الفاظ (اور واضح رہے کہ یہ الفاظ اسی صفحے پر ہیں جس سے ایک مختصر اقتباس سب سے اوپر دیا گیا ہے) یہ ہیں:

> ''از شیخ نظام الدین اولیا منقول ہست کہ شیخ را رنجوریِ خلہ واقع شد کہ آخر بہمان زحمت برحمت حق پیوست ودراں رنجوری مرا بکسوتِ خاص نواختہ، در ماہ شوال سنہ تسع وستین وستماتہ (۶۶۹) بجانبِ دہلی رواں ساخت، دروقتِ وداع آب در دیدہ گردانیدہ گفت برَو ترا بخدایتعالیٰ سپردم''

ترجمہ: شیخ نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ شیخ (بابا صاحب) کو ''خلہ'' کا مرض ہوگیا تھا۔ اسی میں آپ کا انتقال ہوا۔ اس بیماری میں مجھے خلعتِ خاص سے نوازا اور شوال چھ سو انہتر (۶۶۹ھ) کو دہلی رخصت کرتے وقت پرُنم آنکھوں سے کہا: جاؤ میں نے تمھیں اللہ کے سپرد کیا۔

ایک ہی صفحے پر، سنین کے اس صریح تضاد سے ہمیں ضیاء الدین برنی کی

''تاریخِ فیروز شاہی'' کے مترجم ڈاکٹر سید معین الحق یاد آتے ہیں؛ جنھوں نے اپنے ترجمے میں اسی طرح ایک ہی صفحے پر، وضاحت کے طور پر، وضاحت کی بجائے اسی نوعیت کی تضاد بیانی کی تھی جس کا ذکر اس کتاب کے دوسرے حصے میں ہو چکا ہے۔ ان کی اس وضاحت سے، ایک پہلے سے واضح بات، مزید واضح ہونے کی بجائے نہ صرف انتہائی غیر واضح ہوگئی بلکہ غلط ثابت ہوئی۔ اور ہمیں پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی بھی یاد آتے ہیں۔

چوتھا حصہ

چوتھا سوال: صحیح سال وصال کیا ہو سکتا ہے؟ اور اس کی تائید میں کیا اسناد و شواہد ہیں؟

اس کتاب کے دوسرے حصے میں جب ہم اس سوال کا جواب تلاش کر رہے تھے کہ ''کیا ۶۶۴ھ صحیح سالِ وصال ہے؟'' تو ہم نے جواب کا آغاز اس فقرے سے کیا تھا کہ ''اس سوال کا جواب سلطان غیاث الدین بلبن کے سنِ تخت نشینی میں عیاں، اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں پنہاں ہے۔'' اس کتاب کے موجودہ اور چوتھے حصے میں جب ہم اب اس سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں کہ بابا صاحب کا ''صحیح سالِ وصال کیا ہو سکتا ہے'' تو ہم اپنی بات کا آغاز یوں کریں گے کہ اس سوال کا جواب خواجہ نظام الدین کے ملفوظات میں صرف پنہاں نہیں بلکہ اس بھر پور طور سے عیاں ہے کہ ان کی موجودگی میں نہ کسی اور سند یا شہادت کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی کشف کی حاجت۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ہم نے دیکھا کہ (شاید کسی مصلحت کے تحت) بابا صاحب کے سالِ وصال پر ۶۶۴ھ کی روایت کی جو دبیز کہر صدیوں سے چھائی ہوئی تھی، وہ خواجہ صاحب کی رہنمائی میں، چند منٹوں میں، چھٹ گئی۔ کتاب کے اس چوتھے حصے میں اب ہم یہ دیکھیں گے کہ بابا صاحب کے صحیح سالِ وصال کا تعین، خواجہ صاحب کے قطعی اور غیر مبہم ملفوظات کے طفیل صدیوں پہلے ہو چکا تھا۔

یہ ملفوظات ''سیر الاولیاء'' کے تین قلمی نسخوں اور چرنجی لال کے مطبوعہ (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) فارسی اڈیشن میں روشن تاروں کی طرح جگ مگ کر رہے ہیں۔ ان

میں کوئی تفاوت نہیں۔ ان کا تقابلی جائزہ اور اردو ترجمہ پیش ہے۔ ان ملفوظات کا تعلق ۶۶۹ھ میں تسلسل سے ہونے والے ان تین موضوعات اور واقعات سے ہے:

(۱) پچیس جمادی الاولیٰ (۶۶۹ھ) کی بشارت

(۲) یکم شعبان (۶۶۹ھ) کی دعا

(۳) تیرہ رمضان (۶۶۹ھ) کو خلافت نامہ عطا ہونا

فارسی کے یہ قلمی نسخے مختلف اوقات اور مقامات پر لکھے گئے۔ نیچے دیئے ہوئے تقابلی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بعض جگہ کوئی حرف غلط لکھ دیا گیا ہے، کہیں کسی لفظ میں ردوبدل ہوگیا ہے۔ کہیں کوئی لفظ، یا الفاظ، چھٹ گئے ہیں۔ ان سب خامیوں کے باوجود، ان چاروں کتابوں میں ان تین باتوں میں کوئی فرق نہیں:

(۱) اگرچہ نیچے درج شدہ یہ تین اقتباسات، اور چوتھا اقتباس جس کا تقابلی جائزہ اس کتاب کے پہلے حصے میں دے دیا گیا تھا، ''سیر الاولیاء'' کے مختلف صفحات پر ہیں لیکن ان سب میں بابا صاحب کے لیے ''شیخ شیوخ العالم'' کا لقب استعمال کیا گیا ہے۔

(۲) ان چاروں اقتباسات میں کہیں بھی بابا صاحب کے لیے ''شکر گنج'' یا ''گنج شکر'' کا لقب استعمال نہیں ہوا۔

(۳) درج ذیل تینوں اقتباسات میں، سنین عربی زبان کے الفاظ میں لکھے گئے ہیں حالاں کہ فارسی زبان کی کتاب یعنی ''سیر الاولیاء'' میں وہ فارسی زبان میں ہوسکتے تھے۔

دیکھیے ''تقابلی جائزہ'' (E)

مندرجہ بالا تقابلی جائزے سے عیاں ہے کہ ۲۵ جمادی الاولیٰ کا وہ دل پذیر واقعہ، جس کا شکر بار آغاز خواجہ نظام الدین اولیاء کے منہ میں لعابِ دہن ڈالنے سے ہوتا ہے، 'سیر الاولیاء' کے چاروں فارسی نسخوں میں بالکل یکساں مفہوم اور تقریباً یکساں الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ چاروں نسخوں کے مطابق یہ بات ''تسع وستین وستمائیہ'' یعنی ۶۶۹ھ میں ہوئی اور ان اہم ترین الفاظ میں کہیں بھی ایک حرف کی کمی یا بیشی نہیں ہے اور اس اقتباس بلکہ اس کتاب میں، ہماری تحقیق اور توجہ کا مرکز یہی الفاظ ہیں۔

یکم شعبان کے واقعے کے بارے میں بھی یہی صورت حال ہے۔ ''تسع و ستین وستمائیہ'' کے یہ تین اہم ترین الفاظ چاروں نسخوں میں من وعن موجود ہیں اور سنہ ۶۶۹ھ کے بارے میں یہاں بھی شمہ بھر شبہ نہیں۔

تیرہ رمضان کے واقعے کے بارے میں صورتِ حال قدرے مختلف ہے۔ یہاں برٹش لائبریری کے قلمی نسخے اور چرنجی لال (لاہور۔۱۹۷۸ء) مطبوعہ اڈیشن میں تو حسب سابق ''تسع وستین وستمائیہ'' یعنی ۶۶۹ھ ہی لکھا ہے، لیکن کول کتا لائبریری اور کراچی میوزیم کے قلمی نسخوں میں صرف 'ستین وستمائیہ' کے الفاظ ہیں' جس کا مطلب ۶۶۰ھ ہے اور پہلا لفظ ''تسع'' غائب ہے جس کے معنے 'نو' ہوتے ہیں اور جس کے ہونے سے ہی سنہ ۶۶۹ھ بنتا ہے اور جس کے نہ ہونے سے سنہ ۶۶۰ھ نکلتا ہے۔ کول کتا لائبریری کے قلمی نسخے میں لفظ ''سنہ'' کے بعد اور لفظ ''ستین'' سے پہلے، حرف ''و'' ہے جو صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں کوئی ایک لفظ کتابت ہونے سے رہ گیا ہے۔

کراچی اور کول کتا کے قلمی نسخوں میں ۶۶۰ھ کا اندراج بدیہی طور پر درست نہیں۔ اگر بابا صاحب کا خلافت نامہ خواجہ نظام الدین اولیاء کو (رمضان) ۶۶۰ھ میں عطا ہوا ہوتا تو ۶۶۰ھ کا ماہ رمضان ۲۰ جولائی سے ۱۹/ اگست ۱۲۶۲ء کے درمیان تھا جب

خربوزوں کا موسم بھی کا گزر چکا ہوتا ہے اور آموں کا موسم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس حساب سے بابا صاحب کی تاریخ وفات ' تین ماہ بعد' ۵ محرم ۶۶۱ ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۲۶۲ء بنتی ہے جب بلبن سلطان ہی نہیں بنا تھا۔ اس طرح سنہ ۶۶۰ ھ ان رہنما اصولوں کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ان ہی دلائل کی بنا پر، ہم اس کتاب کے تیسرے حصے میں ۶۶۰ ھ اور ۶۶۱ ھ کو رد کر چکے ہیں۔

ان واضح حقائق کی روشنی میں، اب اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ماہِ رمضان کے واقعے کے بارے میں، کراچی اور کول کتا کے قلمی نسخوں میں کاتب حضرات سے، ایک لفظ 'تسع' سہواً حذف ہو گیا جس سے ایک تاریخی غلطی جنم لے سکتی تھی اور ۶۶۴ ھ کی طرح، ۶۶۱ ھ بھی بابا صاحب کا سالِ وصال قرار پا سکتا تھا۔

اگر کول کتا اور کراچی میوزیم کے قلمی نسخوں کے تقابلی جائزے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک کتاب مثلاً چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) اڈیشن ہوتی تو یہ کہنے اور ثابت کرنے کے باوجود کہ کول کتا اور کراچی کے قلمی نسخوں میں درج شدہ سنہ ۶۶۰ ھ (جو صرف ماہِ رمضان کے بارے میں ہے) صریحاً غلط ہے، ہمارے لیے یہ ثابت کرنا مشکل ہوتا کہ کول کتا اور کراچی کے قلمی نسخوں میں بھی اس سنہ (۶۶۹ ھ) کا اندراج بالکل ان ہی الفاظ میں ہونا چاہیے تھا. جو چرنجی لال (لاہور۔ ۱۹۷۸ء) کے مطبوعہ اڈیشن میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہماری یہ مشکل لندن کے قدیم اور مصدقہ نسخے نے آسان کر دی جس میں درج شدہ ''تسع وستین وستماتیہ'' کے الفاظ چرنجی لال اڈیشن کے عین ان ہی الفاظ کی توثیق کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ جمادی الاولیٰ اور شعبان میں ۶۶۹ ھ کا اندراج چاروں کتابوں میں ہر شبہ سے بالاتر ہے اور الفاظ میں اختلاف صرف رمضان ۶۶۹ ھ کے ضمن میں ہے اور یہاں بھی کول کتے کے مخطوطے میں سنہ کے الفاظ میں سے صرف ایک لفظ کا چھوٹ جانا اور حرف ''و'' کا رہ جانا صاف بتا رہا ہے کہ یہاں بھی سالِ

وصال ٦٦٠ھ لکھنا مقصود نہ تھا۔

٦٦٩ھ کے روح پرور واقعات کے ضمن میں، آخر میں، ایک اور بات کا ذکر ہو جائے۔ اس کتاب کے تیسرے حصے کے اختتام پر، تاریخِ فرشتہ (جلد دوئم) کے صفحہ نمبر ٣٩٠ سے مندرجہ ذیل فقرے نقل کیے گئے تھے:

"از شیخ نظام الدین اولیاء منقول ہست کہ شیخ را رنجوریِ خلہ واقع شد کہ آخر بہمان زحمت برحمت حق پیوست و دراں رنجوری مرا بکسوتِ خاص نواختہ، در ماہ شوال سنہ تسع وستین وستماتہ (٦٦٩) بجانبِ دہلی رواں ساخت، در وقتِ وداع آب در دیدہ گردانیدہ گفت بُرو ترا بخدایتعالیٰ سپردم۔"

اگر اس کتاب کا مقصد ٦٧٠ھ کو بابا صاحب کا سالِ وصال قرار دینا ہوتا تو تاریخِ فرشتہ کا یہ اقتباس یہاں اس تبصرے کے ساتھ پیش ہوتا کہ اس اقتباس میں ماہ شوال کے حوالے سے بھی 'تسع وستین وستماتہ' کے وہی الفاظ ہیں جو "سیر الاولیاء" میں جمادی الاولیٰ، شعبان (اور رمضان) کے واقعات کے سنہ کے لیے تسلسل سے استعمال ہوئے ہیں اور اب دیکھیے کہ تاریخِ فرشتہ میں بھی یہ ہی سنہ شوال کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے جو سیر الاولیاء میں دیئے ہوئے سنہ (٦٦٩ھ) کی آزادانہ اور مزید توثیق ہے۔

چوں کہ اس کتاب کا مقصد یہ نہیں، اس لیے ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ تاریخِ فرشتہ کے مندرجہ بالا اقتباس میں ٦٦٩ھ کے سنہ کا ماخذ اور سند کیا ہے؟ اور اس کا عین امکان ہے کہ سنہ ٦٦٩ھ کے 'یہ الفاظ' جو ویسے تو تاریخی طور پر درست ہیں، تاریخ فرشتہ میں خواجہ نظام الدین اولیاء سے غلط منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ شوال (٦٦٩ھ) کے اس واقعے کا ذکر 'سیر الاولیاء' میں بھی ملتا ہے اور وہاں شوال کا ذکر بھی آتا ہے لیکن سنہ کے بغیر۔ 'سیر الاولیاء' کے الفاظ یہ ہیں:

جیسا کہ ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں لکھ چکے ہیں، گفتگو میں کسی واقعے کے وقت، دن، تاریخ یا مہینے کا ذکر تو آتا ہے لیکن سنہ کا ذکر آنا غیر فطری ہے۔ ہماری رائے میں 'سیر الاولیاء' کا (بغیر سنہ کا) مندرجہ بالا اقتباس درست' اور تاریخِ فرشتہ کے اقتباس کا وہ حصہ جہاں ماہ شوال کے ساتھ سنہ ۶۶۹ھ کا بھی ذکر ہے، اضافی ہے اور اسے ۶۶۹ھ میں ہونے والے دوسرے واقعات کی تائید یا توثیق میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔

ان حقائق کی روشنی میں، بابا صاحب کے سالِ وصال کے تعین کے لیے، ہم تاریخِ فرشتہ کو نظر انداز کرتے ہیں، تاہم 'سیر الاولیاء' کے چار مختلف فارسی نسخوں میں، کم از کم دو مختلف مہینوں میں ہونے والے واقعات میں، ۶۶۹ھ کے واضح ذکر کے بعد، اب یہ بات شبہ سے بالا ہو کر، ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر ابھرتی ہے کہ ۶۶۹ھ کے پورے سال بابا صاحب زندہ تھے اور جب ۶۷۰ھ کا آغاز ہوا تو اس کے پانچویں روز، وہ اس وصل سے سرفراز ہوئے جس کی تڑپ شکر گنج کے شکر بار ہونٹوں پر، بار بار، فارسی کے ان اشعار میں ظاہر ہوتی رہی:

فارسی قطعہ	اردو ترجمہ
خواہم کہ ہمیشہ درہوائے تو زیم	میری آرزو ہے کہ جب تک جیوں تیری ہی دھن میں جیوں
خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم	اور جب خاک ہو جاؤں تو تیرے قدموں میں زندہ ہو جاؤں
مقصود من بندہ ز کونین توئی	دونوں جہاں میں میرا مقصود تو ہی تو ہے
از بہر تو میرم از برائے تو زیم	میں تیرے لیے مرتا اور تیرے ہی لیے جیتا ہوں

تقابلی جائزہ (F)

اردو ترجمہ (لاہور۔۲۰۰۴ء) (صفحہ نمبر ۱۸۸)	چرنجی لال (لاہور۔۱۹۷۸ء) (صفحہ نمبر ۹۹)	کراچی میوزیم کا قلمی نسخہ (مفروضہ صفحہ نمبر ۱۱۰)	برٹش لائبریری کا قلمی نسخہ (ورق نمبر ۴۶/ صفحہ نمبر ۹۰)	ایشیاٹک سوسائٹی کولکتہ کا قلمی نسخہ ورق نمبر ۳۵(a)
سلطان المشائخ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ شیخ کی وفات کے وقت موجود تھے؟	ازسلطان المشائخ سوال کردند کہ شمادروقت نقل حاضر بودید	ازسلطان المشائخ سوال کردند کہ شمادروقت نقل حاضر بودند	ازسلطان المشائخ سوال کردند کہ شمادروقتِ نقل حاضر بودید	ازسلطان المشائخ سوال کردند کہ شمادروقت نقل حاضر بودید
اس سوال پر آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے	چشم پرآب کرد	چشم پرآب کرد	چشم پرآب کرد	چشم پرآب کرد
اور فرمایا کہ (نہیں)	وفرمود کہ خیر	وفرمود کہ خیر	وفرمود کہ خیر	وفرمود کہ خیر
آپ (باباصاحب) نے مجھے شوال میں دہلی روانہ کیا تھا۔	درماہِ شوال مرابدہلی رواں کرد	درماہِ شوال مرابدہلی روان کرد	درماہِ شوال مرابدہلی روان کرد	درماہِ شوال مرابدہلی روان کرد

اس کتاب کے تیسرے حصے میں دی ہوئی دوسری جدول (D) کے مطابق، ۵ محرم ۶۷۰ھ کو جمعرات کا دن تھا، جو اگست ۱۲۷۱ء کی تیرہ تاریخ بنتی ہے۔ قمری اور عیسوی تاریخوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے عمل میں، ایک آدھ دن، یا تاریخ، آگے پیچھے ہونا خارج از امکان نہیں۔ یہاں قمری تاریخ یعنی ۵ محرم تو خواجہ نظام الدین اولیاء کے ارشاد کے مطابق بابا صاحب کے وصال کی مستند تاریخ ہے، تاہم اس کی مطابقت میں ایک مستند تقویم کی مدد سے تیرہ اگست کی جو عیسوی تاریخ نکل رہی ہے، وہ ایک آدھ دن آگے پیچھے ہوسکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ہم اب قطعیت سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ بابا صاحب نے (۱۲۷۱ء میں) ۵ محرم ۶۷۰ھ کو وفات پائی، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ۱۳/ اگست (۱۲۷۱ء) تھا۔ ہم یہ کہیں گے کہ اس کا قوی امکان ہے کہ ۵ محرم ۶۷۰ھ کو ۱۳/ اگست (۱۲۷۱ء) تھا، لیکن یہ تاریخ ۱۲/ اگست بھی ہوسکتی ہے اور ۱۴/ اگست بھی اور دن بدھ یا جمعہ بھی ہوسکتا ہے، گو تقویم کے مطابق دن جمعرات نکلتا ہے۔

۵ محرم ۶۷۰ھ کی تائید میں، ایک اور شہادت اس کتاب کے تیسرے حصے میں دی ہوئی پہلی جدول (C) سے عیاں ہے کہ اس تاریخ سے چار روز قبل ختم ہونے والا قمری سال، یعنی ۶۶۹ھ وہ واحد سال تھا جس میں تقریباً پورے رمضان (۶۶۹ھ) کے دوران، یعنی ۲۷ روزوں میں، پاک پتن میں خربوزوں کا موسم رہا. یہ بات نہ ۶۶۹ھ سے پہلے کے برسوں میں پائی جاتی ہے، نہ بعد کے آنے والے کسی برس میں۔

ثانیاً ۵ محرم ۶۷۰ھ کو بلبن کو سلطان بنے ساڑھے پانچ برس ہوگئے تھے جو بلبن کے بیس سالہ عہد کا ابتدائی دور کہلائے گا۔ اس طرح ۶۷۰ھ (مطابق ۱۲۷۱ء) ہی وہ سال بنتا ہے جب مرزا مظہر جان جاناں کے تاریخی قطعے کے مطابق ''فرید الدین ولی واصلِ حق'' ہوگئے۔

پانچواں حصہ

شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال

فرید الدین مسعود گنج شکر (بابا صاحب) کے سالِ وصال کے تعین کے بعد، اب وہ مرحلہ آگیا ہے جہاں ہم ان کے دوست اور ہم عصر شیخ بہاء الدین زکریا کے صحیح سالِ وصال کے تعین کی سعی کریں۔ ان کے سالِ وصال کے بارے میں بھی، آج تک یعنی پچھلے سوا سات سَو برسوں کے دوران، مختلف روایات گردش کرتی رہی ہیں جن میں ان کا سنہِ وصال ۶۵۶ ھ (مطابق ۱۲۵۸ء) ۶۶۱ ھ (مطابق ۱۲۶۲ء) ۶۶۵ ھ (مطابق ۱۲۶۶ء) ۶۶۶ ھ (مطابق ۱۲۶۷ء) اور ۶۶۷ ھ (مطابق ۱۲۶۸ء) بتایا جاتا رہا ہے۔ زیادہ تر روایات ۶۶۱ ھ کے بارے میں ہیں۔ اس مسئلے کو سمجھنے، اور حل کرنے، کے لیے بنیادی سوالات تین ہیں:

(i) اکثر عالمانہ کتابوں اور محققانہ مضامین میں، شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال ۶۶۱ ھ لکھا گیا ہے۔ یہ تحریریں کن کی ہیں؟

(ii) ۶۶۱ ھ کے علاوہ جو دیگر روایتیں ہیں، وہ کن سے منسوب اور کس حد تک قابلِ اعتبار ہیں؟

(iii) صحیح سالِ وصال کیا ہوسکتا ہے اور اس کی تائید میں کیا اسناد وشواہد ہیں؟

پہلا سوال: ٦٦١ ھ کا ذکر مندرجہ ذیل عالمانہ کتابوں اور محققانہ مضامین میں ملتا ہے:

(۱) ''اخبار الاخیار فی اسرار الابرار'' مصنف: شیخ عبدالحق محدّث دہلوی
ناشر: مطبع مجتبائی دہلی سالِ اشاعت: ۱۹۱۴ء
صفحہ نمبر ۲۵ پر تحریر ہے:
'' توفی رحمہ اللہ سابع صفر ٦٦١ (ھ) احدی وستین وستمائۃ''

(۲) ''انوار صوفیہ یعنی اخبار الاخیار فی اسرار الابرار''
مصنف: شیخ عبدالحق محدّث دہلوی
مترجم: محمد لطیف ملک ناشر: شعاعِ ادب، لاہور
پہلا اڈیشن: ۱۹۵۸ء دوسرا اڈیشن: ۱۹۶۲ء
صفحہ نمبر: ٦۲
''آپ (شیخ بہاء الدین زکریا) کی وفات ۷ صفر ٦٦١ ھ کو واقع ہوئی۔''

(۳) 'اخبار الاخیار'' مصنف: شیخ عبدالحق محدّث دہلوی
مترجم: اقبال الدین احمد ناشر: دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
صفحہ نمبر ۵۰ پر تحریر ہے:
''شیخ زکریا نے ۷ صفر ٦٦١ ھ کو جامِ بقا نوش کیا۔''

(۴) ''بزمِ صوفیہ'' مصنف: سید صباح الدین عبد الرحمٰن

دوسرا اڈیشن: ۱۹۷۱ء

ناشر: مطبع معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، بھارت

دوسرے اڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۳۰ پر تحریر ہے:

''(شیخ بہاء الدین زکریا کے) سنِ وفات میں اختلاف ہے۔ ''راحۃ القلوب'' میں سالِ وفات ۶۵۶ ھ، ''سیر الاولیاء'' (ص: ۹۱) میں ۶۶۷ ھ، ''اخبار الاخیار'' میں ۶۶۱ ھ، ''سفینۃ الاولیاء'' اور ''فرشتہ'' میں ۶۶۶ھ اور ''مرآۃ الاسرار'' میں ۵۶۵ ھ ہے۔''

(۵) ''آبِ کوثر'' مصنف: شیخ محمد اکرام

ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور سولھواں اڈیشن: ۱۹۹۴ء

صفحہ نمبر: ۲۶۱

''(شیخ بہاء الدین زکریا) کی وفات ۶۶۱ ھ/۱۲۶۲ء میں ہوئی۔''

(۶) THE LIFE AND TIMES OF SHAIKH FARID-UD-DIN GANJ-I-SHAKAR. مصنف: خلیق احمد نظامی

ناشر: یونیورسل بکس لاہور سال اشاعت: نہیں دیا

صفحہ نمبر: ۵۷ کا زیریں حاشیہ

شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال ۶۶۱ ھ مطابق ۱۲۶۲ء لکھا ہے۔

THE LIFE AND TIMES OF SHAIKH FARID-UD-DIN GANJ-I-SHAKAR. مصنف: خلیق احمد نظامی

ناشر: ادارہ ادبیات دلّی بھارت سالِ اشاعت: ۱۹۹۸ء

صفحہ نمبر ۶۴ کا زیریں حاشیہ

یہاں بھی مندرجہ بالا اندراج ہے۔

(۷) ماہنامہ منادی دہلی (ستمبر ۱۹۷۴ء) مضمون نگار: نثار احمد فاروقی فریدی

صفحات: ۱۶۵ اور ۱۶۹

مضمون بعنوان ''اِسرار الاولیاء۔ایک تنقیدی جائزہ'' میں، پہلے صفحہ نمبر ۱۶۵ اور اس کے بعد صفحہ نمبر ۱۶۹ پر، شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال ۶۶۱ ھ لکھا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۶۵ پر درج شدہ سالِ وصال ''اخبار الاخیار'' کے حوالے سے ہے جس کا تفصیلی ذکر بالائی سطور میں نمبر شمار (۱) پر کیا گیا ہے اور پروفیسر نثار فاروقی صاحب کا یہ حوالہ ''اخبار الاخیار'' میں اس سنہ کا ذکر ہونے کی تائیدِ مزید کرتا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۶۹ پر درج شدہ سالِ وصال (۶۶۱ ھ)، پروفیسر نثار فاروقی کے ان الفاظ میں ہے: ''حضرت بہاء الدین زکریا نے ۶۶۱ ھ میں رحلت فرمائی ہے۔'' یہاں کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

(۸) اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

(اردو اسلامک انسائیکلوپیڈیا) (جلد نمبر ۵) سالِ اشاعت: ۱۹۸۵ء

صفحہ نمبر ۹۵ پر تحریر ہے:

''آپ (شیخ بہاء الدین زکریا) کا انتقال سات صفر ۶۶۱ ھ/ ۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء کو ملتان میں ہوا۔''

(۹) محکمہ اوقاف، حکومتِ پنجاب

شیخ بہاء الدین زکریا کے مزار کے سرہانے ایک بورڈ پر، سرکاری طور پر، آپ کے کوائف تحریر ہیں جس کے مطابق آپ کی "تصدیق شدہ" تاریخِ وفات ۷ صفر ۶۶۱ھ بتائی گئی ہے۔

(۱۰) "شاہ رکنِ عالم ملتانی سہروردی قدس سرہ" مولانا نور احمد خاں فریدی مرحوم

سالِ تصنیف: ۱۳۸۰ھ (مطابق ۱۹۶۰ء) سالِ اشاعت: درج نہیں

ناشر: قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان

صفحہ نمبر: ۳۵

"۷ صفر ۶۶۱ھ کو...... خواجہ بہاء الحق......... سرائے فانی سے عالمِ بقا کو انتقال کر گئے۔"

(۱۱) "تاریخ ملتان" مولانا نور احمد خاں فریدی مرحوم

ناشر: قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان شہر سالِ تصنیف و اشاعت: درج نہیں

صفحات نمبر: ۱۳۹، ۱۷۹ اور ۱۸۵

(i) جلد اوّل۔ صفحہ نمبر ۱۳۹

"رحلت: ۷ صفر المظفر ۶۶۱ھ"

(ii) جلد اوّل۔ صفحہ نمبر ۱۷۹

"۷ صفر ۶۶۱ھ بروز منگل...... حضرت (صدر الدین) عارف باللہ گھبرا کر واپس لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت (بہاء الدین زکریا) کا سرِ نیاز سجدے میں ہے اور روح اعلیٰ علیین کو پرواز کر چکی ہے۔"

"...........""العزیز" بہاول پور کے شمارہ فروری ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں صاحبِ مضمون نے تحریر کیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام (بہاء الدین زکریا) نے سید علی ہجویری کی مشہور عالم تصنیف "کشف المحجوب" کو بھی اپنے ہاتھ سے سپردِ قلم فرمایا تھا...... حال ہی میں جناب احمد ربانی صاحب نے محکمۂ اوقاف کی اعانت سے "کشف المحجوب" کا ایک فارسی نسخہ طبع کرایا ہے۔ ان کا دعوےٰ ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی۔ انہوں نے اس نسخہ کا (کے) پہلے اور آخری صفحے کا عکس بھی دیا ہے مگر اسے حضرت شیخ الاسلام (بہاء الدین زکریا) سے منسوب کرنے میں چند اشکال حائل ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر تاریخ ارقام ۶۶۴ھ درج ہے۔ حالاں کہ حضرت کا سنہ وصال بالاتفاق ۶۶۱ھ ہے۔"

مولانا نور احمد خاں فریدی کے مندرجہ بالا اقتباس پر ہمارے تین تبصرے ہیں۔ اولاً "تاریخِ ارقام ۶۶۴ھ" جسے وہ مشکل قرار دے رہے ہیں، درحقیقت وہ خود سے پیدا کردہ مشکل کا حل ہوسکتا ہے، بلکہ ہے۔ ثانیاً یوں لگتا ہے کہ جس طرح ماہنامہ "منادی" دہلی (ستمبر ۱۹۷۴ء) میں، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے، اپنے علم کی بنا پر، یہ قطعی رائے قائم کرلی تھی کہ بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) ہے اور منادی کے اس شمارے میں شائع شدہ اپنے عالمانہ اور محققانہ مضامین میں، ایک سے زیادہ بار، اپنی بات کا آغاز، یہ کہہ کر کیا تھا کہ "ہمیں معلوم ہے کہ بابا صاحب نے ۶۶۴ھ میں..... انتقال فرمایا ہے۔" اسی طرح مولانا نور احمد خاں فریدی مرحوم نے

بھی، اپنے علم کی بنا پر، یہ قطعی رائے قائم کرلی کہ شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہِ وصال ۶۶۱ھ (مطابق ۱۲۶۲ء) ہے، یا ہونا چاہیئے اور اس بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی ورنہ وہ ہرگز یہ نہ لکھتے کہ حضرت (بہاء الدین زکریا) کا سنہ وصال بالاتفاق ۶۶۱ھ ہے۔ اسی طرح وہ ''کشف المحجوب'' کے اس نسخے کو جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے شیخ بہاء الدین زکریا نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور اس پر اپنے دستخط کے ساتھ ۶۶۴ھ کا سنہ درج کیا ہے، شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے یہ طنزیہ فقرہ نہ لکھتے کہ ''ان کا دعوٰے ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی۔'' ثالثاً ان کا یہ کہنا کہ ۶۶۱ھ بالاتفاق سنہ وصال ہے، ''بزم صوفیہ'' کے اس بیان سے غلط ثابت ہو جاتا ہے جس میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ آپ کے ''سنہِ وفات میں اختلاف ہے'' اور سنہِ وفات کے طور پر ۶۵۶ھ، ۶۶۶ھ، اور ۶۶۷ھ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس بیان کا اندراج بالائی سطور میں نمبر شمار ۴ پر کیا گیا ہے۔

دوسرا سوال: ۶۶۱ء کے علاوہ دیگر روایتیں

- ۶۵۶ھ

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے اپنی کتاب ''بزمِ صوفیہ'' میں لکھا ہے کہ ''راحتہ القلوب'' کے مطابق شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وفات ۶۵۶ھ ہے۔ یاد رہے کہ اس کتاب کے تیسرے حصے میں ''راحت القلوب'' کے حوالے سے ہی وحید احمد مسعود فریدی مرحوم، بابا صاحب کا سالِ وصال ۶۸۷ھ بتا چکے ہیں (جو درست نہیں ہو سکتا)۔ اگر ''راحت القلوب'' کے بتائے ہوئے ان دونوں سنین کو مان لیا جائے تو بابا صاحب کا وصال شیخ بہاء الدین زکریا کی وفات کے ۳۱ برس بعد ہوا۔ یہ تاریخی طور

پر درست نہیں ہوسکتا، چنانچہ ۶۵۶ھ شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال نہیں۔

''راحت القلوب'' باباصاحب کے ان مبینہ ملفوظات پر مشتمل ہے جو کہا جاتا ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنے پاک پتن کے قیام کے دوران مرتب کیے۔ اس کتاب کے اصلی ہونے کے بارے میں بہت قوی شبہات ہیں جن پر ایک مختصر تبصرہ اس کتاب کے تیسرے حصےؔ میں کیا جاچکا ہے۔

- ۶۶۵ھ

(i) ابوالفضل کی ''آئین اکبری'' کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے۔ اس کی جلد دوئم کے صفحہ نمبر ۳۲۸ پر تحریر ہے:

''(شیخ بہاء الدین زکریا نے) ۶۶۵ ہجری ماہِ صفر میں........ رحلت فرمائی۔''

(ii) شیخ عبدالرحمٰن چشتی کی ''مرآۃ الاسرار'' کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے۔ اس کے ترجمے کے صفحہ نمبر ۷۰۰ پر درج ہے:

''آپ کا وصال سات ماہِ صفر ۶۶۵ھ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں ہوا۔''

''پہلا سوال'' کے عنوان کے تحت نمبر شمار ۴ پر ''بزم صوفیہ'' کا ذکر آیا تھا جس میں کاتب کی سہو سے مرآۃ الاسرار کے حوالے سے دیا جانے والا مندرجہ بالا درج شدہ سنہ، ۶۶۵ھ کی بجائے، ''بزم صوفیہ'' میں ۵۶۵ھ چھپ گیا ہے۔ یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ بلبن کا عہدِ حکومت یکم جنوری ۱۲۶۶ء / مطابق ۲۲ ربیع الاول ۶۶۴ھ کے بعد شروع ہوا۔ اگر سالِ وصال (۷ صفر) ۶۶۱ھ ہوتا، جو مشہور چلا آرہا ہے تو وہ بلبن کے عہدِ حکومت میں نہیں ہوسکتا تھا جو اس تاریخ کے تین برس بعد شروع ہوا۔

● ۶۶۶ھ

(i) داراشکوہ کی ''سفینۃ الاولیاء'' کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس کے صفحہ نمبر ۱۵۲ پر درج ہے:

'' آپ (شیخ بہاء الدین زکریا) کی وفات جمعرات کے دن .... ۷ ماہ صفر ۶۶۶ھ کو ہوئی۔''

واضح رہے کہ اس کتاب کے پہلے حصے میں، نمبر شمار X کے تحت، ہم نے داراشکوہ کی اسی کتاب میں درج شدہ بابا صاحب کا سالِ وصال نقل کیا تھا جو اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۳ کے مطابق ۶۶۴ھ ہے (جو درست نہیں ہوسکتا۔) اگر سفینۃ الاولیاء کے بتائے ہوئے ان دونوں سنین کو مان لیا جائے تو بابا صاحب کا وصال شیخ بہاء الدین زکریا کی وفات سے دو برس پہلے ہوگیا تھا۔ یہ تاریخی طور پر درست نہیں ہوسکتا. چنانچہ ''سفینۃ الاولیاء'' کی روایت وہاں بھی درست نہیں اور یہاں بھی نہیں۔

(ii) ''پہلا سوال'' کے عنوان کے تحت، نمبر شمار ۴ پر ''بزم صوفیہ'' کا ذکر آیا تھا جس کے مطابق ''سفینۃ الاولیاء'' اور ''فرشتہ'' میں شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال ۶۶۶ھ ہے۔ ''سفینۃ الاولیاء'' پر تو ہمارا تبصرہ اوپر گزر چکا۔ ''تاریخ فرشتہ'' میں بابا صاحب کے بارے میں سنین کا ذکر، الفاظ میں کرنے کے باوجود، ان سنین میں جو بدیہی اور فاش غلطیاں ہیں، ان کا ذکر اور ان پر ہمارا تبصرہ بھی اس کتاب کے تیسرے حصے میں موجود ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ''تاریخ فرشتہ'' پر قطعاً اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

(iii) محمد اجمل چشتی فاروقی صاحب کی کتاب ''چلہ گاہیں'' کا ذکر بھی اوپر ہو چکا ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۸۹ پر درج ہے:

'' لطائفِ اشرفی اور دوسری بہت سے (سی) قریب العصر کتابوں میں شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کا سنِ (سنہ) وصال ۶۶۶ھ ہے حتیٰ کہ

جواہرِ فریدی کی فہرست اعراس میں بھی ان کا سنِ (سنہ) وصال ۶۶۶ھ مرقوم ہے۔ اس نسبت سے تین سال بعد، شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا سنِ (سنہ) وصال ۵ محرم الحرام ۶۷۰ھ ہے، اور یہ بھی پیش نظر رہے کہ ۶۷۰ھ کے صرف پانچ دن ہیں جو ۶۶۹ھ میں شامل کر کے تین سال بعد کی مصدقہ روایت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔"

مندرجہ بالا سطور پر، ہمارا مختصر تبصرہ یہ ہے کہ اگر شیخ بہاء الدین زکریا کا انتقال (۷ صفر) ۶۶۶ھ کو ہوا ہوتا تو اس میں تین برس جمع کر کے بابا صاحب کا سالِ وصال (۵ محرم) ۶۶۹ھ بنتا، نہ کہ ۵ محرم ۶۷۰ھ۔ ہم اس کتاب کے تیسرے حصے میں بتا چکے ہیں کہ بابا صاحب کے سالِ وصال کے طور پر ۶۶۹ھ کا ذکر صرف "مرآۃ الاسرار" میں درج ہے اور وہ بھی ایک روایت کے طور پر جس کی تائید یا توثیق میں کوئی اور روایت موجود نہیں۔ خود مرآۃ الاسرار کے مؤلف کے اس سنہ (۶۶۹ھ) کے بارے میں تحفظات "مرآۃ الاسرار" کی تحریر سے واضح ہیں۔

- ۶۶۷ھ

مخبر الواصلین

مؤلف: ابوعبداللہ محمد فاضل بن سید احمد بن سید حسن الحسینی الترمذی اکبرآبادی (تخلص: مظہرالحق)

اس مخطوطے اور مطبوعہ کتاب کے کوائف، اس کتاب کے تیسرے حصے میں، نمبر شمار xi پر دیئے گئے ہیں۔ وہاں ذکر کیا گیا تھا کہ اس مخطوطے کے ورق نمبر ۶۰ (a) اور مطبوعہ کتاب کے صفحہ نمبر ۵۷ پر، ایک تاریخی مصرعے کے ذریعے بابا صاحب کا صحیح سالِ وصال (۶۷۰ھ) نکالا گیا ہے۔ اسی مخطوطے کے ورق نمبر ۵۸ (a) اور مطبوعہ کتاب

کے صفحہ نمبر ۵۶ پر مندرجہ ذیلِ الفاظ سے شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال نکالا گیا ہے:

لیک شد سالِ نقلِ اُو بہ یقیں
''شاہبازِ مقامِ علیّین''

۶۶۷ھ

یہاں دو باتیں نوٹ کرنے والی ہیں۔ اولاً اس مخطوطے اور کتاب میں بابا صاحب کا جو سنہِ وصال بتایا گیا تھا، یعنی ۶۷۰ھ، وہ ہر کسوٹی پر پرکھنے کے بعد صحیح نکلا ہے۔ ثانیاً اس مخطوطے اور کتاب کے مطابق شیخ بہاء الدین زکریا کا انتقال بابا صاحب کے وصال سے تین برس پہلے ہوا۔ اس وقفے کی اہمیت آگے واضح ہوگی۔ کتاب کے اس، یعنی پانچویں، حصے میں ''پہلا سوال'' کے عنوان کے تحت، نمبر شمار ۴ پر ''بزمِ صوفیہ'' کا ذکر آیا تھا جس کے مطابق ''سیر الاولیاء'' میں صفحہ نمبر ۹۱ پر شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال ۶۶۷ھ لکھا ہے۔ اس کے برعکس، اسی صفحہ ۹۱ کا حوالہ دے کر، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے جو کچھ لکھا، وہ ناقابلِ یقین ہے۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی کے مضامین کا ذکر کیا گیا تھا، جو ماہنامہ ''منادی'' دہلی (ستمبر ۱۹۷۴ء) میں شائع ہوئے تھے۔ ماہنامہ منادی کے اس شمارے میں، ''سیر الاولیاء'' کے اسی صفحہ نمبر ۹۱ کا حوالہ دیتے ہوئے، جس کا ذکر ابھی اوپر گزرا ہے، پروفیسر نثار صاحب نے ''منادی'' دہلی کے صفحہ نمبر ۱۴۵ پر جو لکھا تھا، وہ مضمون کے پہلے حصے میں نقل کردیا گیا تھا اور سہولت کے لیے یہاں پھر درج کیا جاتا ہے:

''شیخ سعد الدین حمویہ نے ۶۵۵ھ میں انتقال کیا۔ اس کے تین سال بعد ۶۵۸ھ میں شیخ سیف الدین باخرزی کی وفات ہوئی اور ان سے تین سال بعد ۶۶۱ھ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا

تقابلی جائزہ (G)

اردو ترجمہ (لاہور۔ ۲۰۰۴ء) (صفحہ نمبر ۱۹۱)	چرنجی لال (لاہور۔۱۹۷۸ء) (صفحہ نمبر ۱۰۱)	کراچی میوزیم کا قلمی نسخہ (مفروضہ صفحہ نمبر ۱۱۳)	برٹش لائبریری کا قلمی نسخہ (ورق نمبر ۴۷ کی پشت صفحہ نمبر ۹۳)	ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا کا قلمی نسخہ (ورق نمبر ۳۶(b))
سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ پہلے شیخ سعد الدین حمویہ نے وفات پائی اوران کے تین سال بعد شیخ سیف الدین باخرزی نے ،ان کے تین سال بعد شیخ بہاء الدین زکریا نے ،ان کے تین سال بعد شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرۃ العزیز نے وفات پائی۔	سلطان المشائخ فرمود کہ اول شیخ سعد الدین حمویہ نقل کرد، بعداز وبسہ سال شیخ سیف الدین باخرزی، بعداز وبسہ سال شیخ بہاؤ الدین زکریا، بعداز و بسہ سال شیخ شیوخ العالم فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز۔	سلطان المشائخ فرمود کہ اول شیخ سعد الدین حمویہ نقل کرد، بعداز وبسہ سال سیف الدین باخرزی، بعداز وبسہ سال شیخ بہاء الدین زکریا، وبعداز و بسہ سال شیخ شیوخ العالم فرید الدین ارواحہم۔	سلطان المشائخ فرمود کہ اول شیخ سعد الدین حمویہ نقل کرد، بعداز وبسہ سال شیخ سیف الدین باخرزی، بعداز وبسہ سال شیخ بہاء الدین زکریا، بعداز و بسہ سال شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہم العزیز۔	سلطان المشائخ فرمود کہ اول شیخ سعد الدین حمویہ نقل کرد، بعداز وبسہ سال شیخ سیف الدین باخرزی، بعداز وبسہ سال شیخ بہاؤ الدین زکریا، بعداز و بسہ سال شیخ شیوخ العالم فرید الدین قدس اللہ ارواحہم۔

وصال ہوا اور ان سے تین سال بعد حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔ (حوالہ سیر الاولیاء۔ ۹۱)''

دلچسپ بات یہ ہے کہ سیر الاولیاء (چرنجی لال۔ ۱۸۸۵ء اڈیشن) کے صفحہ ۹۱ پر جو سیر الاولیاء (لاہور۔ ۱۹۷۸ء اڈیشن) کا صفحہ نمبر ۱۰۱ ہے، اس بارے میں قطعاً کوئی سنہ درج نہیں۔ چنانچہ نہ ''بزم صوفیہ'' کا یہ بیان درست ہے کہ سیر الاولیاء کے صفحہ ۹۱ کے مطابق، شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وفات ۶۶۷ھ ہے اور نہ ہی پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے، سیر الاولیاء کے صفحہ ۹۱ کے حوالے سے، اوپر جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے اور اس کے متعلق صرف یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر صاحب جیسی علمی فضلیت کی حامل شخصیت سے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ وہ ''سیر الاولیاء'' کے صفحہ نمبر ۹۱ کا واضح حوالہ دینے کے بعد، اس کتاب کے صفحہ نمبر ۹۱ پر چھپے ہوئے اس کے اصل متن میں، ہر ولی اللہ کے سالِ وصال میں تین تین برس کے وقفے کے (صحیح) ذکر کے بعد، چاروں اولیاء اللہ کی وفات کے ذکر کے ساتھ، اپنی جانب سے، ایک ایک سنہِ وفات کا (غلط) اضافہ کر ڈالیں گے۔ سیر الاولیاء میں کیا درج ہے؟ اس کا متعلقہ اقتباس پیش ہے جس کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی:

دیکھیے ''تقابلی جائزہ'' (G)

مندرجہ بالا ذکر ''فوائد الفواد'' کی چوتھی جلد کی گیارھویں مجلس میں بھی ہے، جو انتیس (۲۹) ذی الحجہ ۷۱۴ھ (مطابق پانچ اپریل ۱۳۱۵ء) ہفتے کے دن دہلی میں منعقد ہوئی۔ ہم بوجوہ پہلے اس کے متعلقہ اقتباس کا انگریزی ترجمہ پیش کریں گے، پھر مطبوعہ فارسی متن، اس کے بعد دو اردو تراجم، اور آخر میں ایشیاٹک سوسائٹی کول کتے کے تین سو

سالہ مخطوطے سے اقتباس۔

(i) "MORALS FOR THE HEART"

Translator: Bruce B.Lawrence

Publisher: Paulist Press, 997 MacArthur Boulevard, Mahwah, New Jersey- 07430 U.S.A.

Year of Publication; 1992.

صفحہ نمبر ۲۳۰ پر درج ہے:

'Then the master .... may God remember him with favour.......noted:

> **"Shaykh Sa'd ad-din Hamuya died, then three years later Shaykh Sayf ad-din Bakharzi died, and three years after him, Baha ad-din Zakariya, and finally three years later Shaykh Farid ad-din (also died.)"**

''فوائد الفواد'' کا مندرجہ بالا انگریزی ترجمہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ان ملفوظات کے مطابق ہے جو سیر الاولیاء کے ان تمام نسخوں میں درج ہیں جن کا تقابلی جائزہ اوپر دیا گیا ہے۔ تاہم ''فوائد الفواد'' کے فارسی اڈیشن (لاہور۔ ۱۹۶۶ء) اور اس کے دونوں اردو تراجم میں صرف یہ تحریر ہے کہ پہلے شیخ سعد الدین حمویہ کا انتقال ہوا اور اس کے تین برس بعد شیخ فرید الدین کا۔ وہ ذی علم حضرات جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے سیرت نگار اور ''فوائد الفواد'' کے مستقل قاری ہیں، اس رائے کے حامل ہیں کہ ''فوائد الفواد'' کے فارسی اڈیشن اور اس کے دونوں اردو تراجم کے متعلقہ اقتباسات میں جہاں صرف شیخ سعد الدین حمویہ اور بابا صاحب کا ذکر ہے، ان کا متن نامکمل ہے۔ ان کی اس رائے کی تائید اس قدیم مخطوطے کے اقتباس سے ہوتی ہے جو نیچے نمبر شمار (v) پر دیا گیا ہے۔

نامکمل متن نیچے (ii)، (iii) اور (iv) پر درج ہیں۔

(ii) 'فوائد الفواد' سالِ اشاعت: ۱۹۶۶ء

ناشر: شیخ سراج الدین اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور،

صفحہ نمبر ۲۲۳ پر تحریر ہے:

''خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ اوّل شیخ سعد الدین حمویہ نقل کرد، بعد از و بہ سال شیخ فرید الدین رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔''

(iii) 'فوائد الفواد' مترجم: محمد سرور

ناشر: علماء اکیڈمی، محکمہ اوقاف، حضوری باغ، لاہور سالِ اشاعت: ۱۹۸۰ء

صفحہ نمبر ۱۷۲ پر تحریر ہے:

'ارشاد کیا کہ پہلے شیخ سعد الدین کا انتقال ہوا، اس کے تین سال بعد شیخِ فرید الدین انتقال فرما گئے۔'

(iv) 'فوائد الفواد' مترجم: خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی،

ناشر: اردو اکادمی، دریا گنج، دہلی سالِ اشاعت: ۲۰۰۱ء

صفحہ نمبر ۶۳۱ پر تحریر ہے:

'خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ پہلے شیخ سعد الدین حمویہ نے انتقال کیا، ان کے تین سال بعد شیخ فرید الدین نے۔ رحمتہ اللہ علیہم اجمعین'

(۷) 'فوائد الفواد' قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا
(عہدِ عالمگیری میں کتابت ہوا)

یہ مخطوطہ "Persian Society Collection-239" کی درجہ بندی کے تحت ایشیاٹک سوسائٹی میوزیم کول کتا میں محفوظ ہے۔ اس کی کتابت ۱۱۰۷ھ (مطابق ۱۶۹۵ء) میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت کے آخری عشرے میں ہوئی۔ ورق نمبر ۲۰۱ (a) پر یہ اندراج ہے:

''خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ اول شیخ سعد الدین حمویہ نقل کرد، بعد از وبہ سال شیخ سیف الدین باخرزی، و بعد از و بہ سال شیخ بہاء الدین زکریا، بعد ازاں بہ سال شیخ فرید الدین رحمہ اللہ اجمعین''

خواجہ نظام الدین اولیاء شیخ بہاء الدین زکریا کے ہم عصر خورد تھے۔ خواجہ صاحب کی جوانی کے زمانے میں پہلے شیخ بہاء الدین زکریا اور پھر بابا صاحب واصل بحق ہوئے۔ خواجہ صاحب سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ ان کے دونوں بزرگ ہم عصروں کی وفات کے درمیان کتنے برس کا وقفہ تھا۔ خواجہ صاحب کی رہنمائی میں، جو ان کے مندرجہ بالا ملفوظات کی صورت میں، ساڑھے چھے صدیوں سے 'سیر الاولیاء' میں درج ہے، اور جن کے بارے میں کبھی کوئی اختلاف رائے نہیں رہا؛ شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وصال نکالنے کے لیے ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ بابا صاحب کے سنہ وصال سے تین سال منہا کر دیں۔

کتاب کے چوتھے حصے میں، خواجہ نظام الدین اولیاء کی اس رہنمائی میں جو ان کے ملفوظات کی صورت میں 'سیر الاولیاء' میں درج ہے، ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بابا صاحب کا سنہ وصال (۵ محرم) ۶۷۰ھ ہے اور اسی رہنمائی میں ہم اس کتاب

کے موجودہ پانچویں حصے میں اب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وصال (۷صفر) ۶۶۷ھ ہے۔ شاہ جہاں کے عہد (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) میں، 'مخبر الواصلین' نے اسی سنہ (۶۶۷ھ) کی خبر دی تھی۔ یہی وہ سنہ ہے جو 'سیر الاولیاء' کا غلط حوالہ دینے کے بعد، اور اس کے باوجود، سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے قلم سے ان کی کتاب 'بزم صوفیہ' میں صحیح نکلا تھا، یہ سنہ 'مرآۃ الاسرار' کے مصنف شیخ عبد الرحمٰن چشتی کے اس بیان کے بھی مطابق ہے کہ شیخ بہاء الدین زکریا کا وصال بلبن کے عہد حکومت میں ہوا، جب کہ ۶۶۱ھ (بمطابق ۱۲۶۲ء) بلبن کے سلطان بننے سے کم از کم تین برس پہلے آتا ہے۔

آخر میں صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ ۶۶۱ھ کے سالِ وصال ہونے کی روایت کہاں سے چلی؟ ایک بار پھر، ہماری نظر 'سیر الاولیاء' کے اس حاشیے، یا اضافی عبارت، کی طرف اٹھتی ہے جہاں 'سیر الاولیاء' کی تصنیف کے بعد کسی لکھنے والے نے یہ لکھ دیا تھا کہ کسی سے 'پوشیدہ نہ رہے' کہ حضرت گنج شکر کی وفات ۶۶۴ھ میں ہوئی۔ جس طرح ہم نے ابھی ۶۷۰ھ سے تین سال منہا کر کے شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وفات ۶۶۷ھ نکالا ہے، اسی طرح پچھلوں نے ۶۶۴ھ سے تین سال منہا کر کے شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وفات ۶۶۱ھ نکالا ہوگا۔ اس طرح اس ایک حاشیے، یا اضافی عبارت، نے ملتان سے تعلق رکھنے والے ان دو عظیم صوفیہ کے سنینِ وفات کو، صدیوں تک، کروڑوں، بلکہ اربوں انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا۔

تقویم کے مطابق ۷ صفر ۶۶۷ھ کو منگل کا دن اور ۱۶/ اکتوبر ۱۲۶۸ء تھا۔ عیسوی کیلنڈر میں ایک آدھ دن آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ یہ تاریخ ۱۵/ اکتوبر بھی ہو سکتی ہے اور ۱۷/ اکتوبر بھی، اور یوم وفات پیر بھی ہو سکتا ہے اور بدھ بھی۔

جس طرح پاک پتن میں، بابا صاحب کے مزار کے سرہانے، چند برس قبل،

موجودہ دیوان نے، اپنا نام نیچے لکھ کر، ایک تختی نصب کی ہے جس پر 'سیر الاولیاء' کا (غلط) حوالہ دے کر یہ درج کیا گیا ہے کہ بابا صاحب کا سالِ وصال (۵ محرم) ۶۶۴ھ ہے، اسی طرح ملتان کے تاریخی قلعے پر واقع شیخ بہاء الدین زکریا کے مزار کے سرہانے، حکومت پنجاب کے محکمہ اوقاف کی جانب سے ایک بورڈ لگایا گیا ہے جس پر (۷ صفر) ۶۶۱ھ کو ان کا 'تصدیق شدہ' سالِ وصال تحریر کیا گیا ہے۔ یہ تختی اور بورڈ اب ہٹ جانے چاہییں اور اس کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ اس تختی اور بورڈ کی وجہ سے ان لاکھوں عقیدت مندوں کو، بلاوجہ، ایک غلط اطلاع فراہم کی جا رہی ہے جو ان عظیم صوفیہ کے مزارات پر عقیدت سے حاضری دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان بزرگوں کے مزارات پر ان کے سنینِ وصال معلوم کرنے کے لیے تو حاضر نہیں ہوتے لیکن اگر انہیں وہاں اس طرح کی تختیاں اور بورڈ نظر آئیں تو وہ یہ سمجھنے، اور دوسروں کو بتانے، میں حق بجانب ہوں گے کہ ان بزرگانِ دین کے سنینِ وصال وہ ہیں جو ان کے سرہانے (غلطی سے) لکھ کر لگا دیے گئے ہیں۔

چھٹا حصہ

خواجہ نظام الدین اولیاء کا سنہِ ولادت

جس طرح بابا صاحبؒ کے سالِ وصال کے بارے میں ۶۶۰ ھ سے ۷۶۰ ھ تک سو سال پر محیط، مختلف سنین لکھے جاتے رہے، ویسے ہی ان کے محبوب خلیفہ خواجہ صاحبؒ کے سنہِ ولادت کے بارے میں بھی مختلف حضرات نے، جن میں نامی گرامی محقق، موَرخ اور مصنف سبھی شامل ہیں، مختلف سنین درج کیے ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی درست نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحبؒ کے سنہ ولادت کے تعین کی کلید بابا صاحبؒ کے سالِ وصال میں تھی۔ بابا صاحبؒ کے سالِ وصال کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے خواجہ صاحبؒ کا صحیح سنہِ ولادت بھی تا حال متعین نہ ہو سکا۔ اب کہ بابا صاحبؒ کے سالِ وصال کا تعین ہو چکا ہے، وہ وقت آگیا ہے کہ خواجہ صاحبؒ کے فرمودات کی راہ نمائی میں، خواجہ صاحبؒ کے سنہِ ولادت کا تعین بھی کر دیا جائے۔ خواجہ صاحبؒ کے یہ فرمودات ''فوائد الفواد'' اور ''سیر الاولیاء'' میں محفوظ ہیں جن سے متعلقہ اقتباسات پیش ہیں۔

(I) فوائد الفواد

خواجہ صاحبؒ کے سنہِ ولادت کے بارے میں ''فوائد الفواد'' کی یہ دو مجالس اہم ہیں:

(i) ۲۷ ذی قعدہ ۷۰۹ ھ (مطابق ۲۸ / اپریل ۱۳۱۰ ء) بروز بدھ ہونے والی مجلس جو دوسری جلد میں دوسری مجلس ہے۔

(ii) ۲۷ ربیع الاوّل ۷۱۰ھ (مطابق ۲۴/ اگست ۱۳۱۰ء) بروز پیر ہونے والی مجلس جو دوسری جلد میں آٹھویں مجلس ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مجلس جو دوسری جلد کی اگلی یعنی نویں مجلس ہے اور ۱۰ ربیع الثانی ۷۱۰ھ (مطابق ۶ ستمبر ۱۳۱۰ء) بروز ہفتہ منعقد ہوئی، دلچسپی کی حامل ہے، گو اس کا تعلق سنہِ ولادت سے نہیں۔

نمبر شمار (ii) پر مذکورہ دو مجلسوں کا ذکر، بعد میں، متعلقہ واقعات کے ساتھ کیا جائے گا۔ فی الحال نمبر شمار (i) پر حوالہ دی جانے والی مجلس میں آپ کے فرمودات میں سے صرف ایک فقرے کا مطبوعہ فارسی متن اور اس فقرے کا اردو اور انگریزی ترجمہ نیچے درج کیا جا رہا ہے، جن کے مابین کوئی فرق نہیں۔ یہ فقرہ فارسی، اردو اور انگریزی میں درج کرنے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہ پائے جانے کی وضاحت دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس کتاب کے پانچویں حصے میں، شیخ بہاء الدین زکریا کے سالِ وصال کے تعین کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ''فوائد الفواد'' کا انگریزی ترجمہ کچھ تھا، جو ''فوائد الفواد'' کے قدیم قلمی نسخے اور ''سیر الاولیاء'' سے مطابقت رکھتا تھا، اور ''فوائد الفواد'' کے مطبوعہ فارسی متن اور اس کے دو اردو تراجم میں اس بارے میں کچھ اور ہی درج تھا۔ نمبر شمار (i) پر مذکورہ مجلس کا فارسی متن اور اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ یہ ہے:

(الف) فوائد الفواد (مطبوعہ فارسی) سالِ اشاعت: ۱۹۶۶ء

ناشر: شیخ سراج الدین اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور

صفحہ نمبر ۷۰ پر، ۲۷ ذی قعدہ ۷۰۹ھ کو دوسری جلد کی دوسری مجلس میں، یہ فقرہ درج ہے:

''بر لفظ مبارک راند کہ من سہ کرّت بخدمت شیخ الاسلام فرید الحق والدّین قدس اللہ سرّہ العزیز رفتہ ام، ہر سال یک بار''

(ب) فوائد الفواد (اردو ترجمہ)　　　مترجم: خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی

سالِ اشاعت: ۲۰۰۱ء

صفحہ نمبر: ۳۲۵

''زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ میں تین دفعہ شیخ الاسلام فرید الحق والدّین قدس اللہ سرّہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہر سال ایک مرتبہ''

(ج) **" MORALS FOR THE HEART"**

Translator : Burce B. Lawrence

Pages 128-129:

'' From his blessed lips, he recounted: ''Three times, once each year, while he (BABA FARID) was alive, I had gone to visit Shaykh al-Islam Farid of Truth, of Law, of Faith - may God sanctify his lofty secret."

(II) سیر الاولیاء

سیر الاولیاء کے سات اقتباسات اس جدول میں درج ہیں:

دیکھیے ''جدول'' **(H)**

ماہ شوال میں دہلی کے لیے روانگی کے بارے میں فوائد الفواد میں بھی ذکر ہے۔ فوائد الفواد کی دوسری جلد کی آٹھویں مجلس میں، جو ۲۷ ربیع الاوّل ۷۱۰ ھ (۲۴/ اگست ۱۳۱۰ء) بروز پیر منعقد ہوئی، خواجہ صاحب سے فوائد الفواد کے مرتّب امیر حسن علا سجزی نے پوچھا:

"کیا آپ شیخ کے انتقال کے وقت موجود تھے؟ حضرت آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور ارشاد کیا کہ نہیں مجھے شوال کے مہینے میں دہلی بھیج دیا تھا۔"

(صفحہ نمبر ۳۶۱۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے اردو ترجمے سے)

مندرجہ بالا ملفوظات میں گو ماہِ شوال کے سنہ کا تذکرہ نہیں لیکن سیاق و سباق سے واضح ہے کہ بات سنہ ۶۶۹ ھ (۱۲۷۱ء) کے ماہ شوال کے بارے میں ہو رہی ہے۔

فوائد الفواد کے دو، اور سیر الاولیاء کے سات مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں، خواجہ صاحب کے سنہِ ولادت کے حوالے سے، مندرجہ ذیل تین نکات ابھرتے ہیں:

(۱) جب آپ بابا صاحب کے مرید ہوئے، اور یہ بے بہا اور لازوال دولت پہلی حاضری میں ہی نصیب میں لکھ دی گئی تھی، تو آپ کی عمر ۲۰ سال تھی۔

(۲) آپ بابا صاحب کی حیات میں تین بار ان کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوئے کہ ہر برس ایک بار حاضری ہوتی رہی۔

(۳) سنہ ۶۶۹ ھ کی حاضری، بابا صاحب کی حیات میں، خواجہ صاحب کی پاک پتن میں تیسری (اور آخری) حاضری تھی۔

تیسری حاضری کے سنہ کا تعین تو ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ دوسری حاضری کس سنہ میں ہوئی؟ اور پہلی حاضری کس سنہ میں ہوئی؟ آیا یہ حاضریاں تین متواتر برسوں میں لگاتار ہوئیں؟ یا اس طرح ہوئیں کہ پہلی اور دوسری حاضری کے درمیان برسوں کا وقفہ ہوا؟ یا یہ کہ دوسری اور تیسری حاضری کے درمیان برسوں کا وقفہ ہوا؟ یا/ اور یہ کہ پہلی اور دوسری حاضری کے درمیان بھی برسوں کا وقفہ ہوا، اور ایسا ہی وقفہ دوسری اور تیسری حاضری کے درمیان بھی ہوا؟

اس سوال کا جواب کتابوں میں تو نہیں ملتا لیکن عقلِ سلیم سے یہ ملتا ہے کہ

باباصاحب کو دیکھے بغیر، اور صرف ان کا نام اور ذکر سن کر، خواجہ صاحب کو، لڑکپن سے، باباصاحب سے جو والہانہ محبت ہوگئی تھی اور ۲۰ سالہ نوجوان نظام الدین کی ۸۷ سالہ فریدالدین مسعود گنج شکر سے پہلی ملاقات کے وقت باباصاحب عمر کے جس حصے میں تھے، اس کے پیش نظر خواجہ صاحب نے اپنی پہلی حاضری کے بعد، اپنی بقیہ دو حاضریوں کے درمیان سال بھر کا وقفہ نہیں آنے دیا ہوگا۔ آتشِ فراق صرف ایک طرف تو نہیں سلگ رہی تھی۔ سیلابِ اشتیاق صرف ایک طرف تو نہیں بہہ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے محبّ اور محبوب تھے۔ اگر یہ درست ہے، جو کہ درست ہے، تو پاک پتن میں خواجہ صاحب کی پہلی حاضری ۶۶۷ ھ، دوسری ۶۶۸ ھ اور، باباصاحب کی حیات میں، تیسری اور آخری حاضری، جس کی سند موجود ہے، ۶۶۹ ھ میں ہوئی۔ یہ سند سیر الاولیاء کے وہ اقتباسات ہیں جو بالائی سطور میں دی گئی جدول میں نمبر شمار ۴، ۵، ۶ اور ۷ پر دیئے گئے ہیں۔

خواجہ صاحب کے پہلے سفر (۶۶۷ ھ) کے بارے میں علم نہیں کہ وہ کس ماہ یا موسم میں شروع ہوا۔ عشق کے سفر میں موسم کی ڈائری نہیں لکھی جاتی۔ ایک روز فجر کے وقت دلّی کی ایک مسجد کے ایک مینار سے اللہ کا کلام عشق کا پیغام بن کر گونجا اور خواجہ صاحب ایک اضطراری کیفیت میں، بے سروسامانی کے عالم میں، دلّی سے پاک پتن کے لیے فوراً روانہ ہوگئے اور افتاں وخیزاں منزلیں مارتے ہوئے، بدھ کے روز، پاک پتن پہنچ گئے۔

خواجہ صاحب کے دوسرے سفر (۶۶۸ ھ) کے بارے میں بھی اسی طرح علم نہیں کہ وہ کس ماہ یا موسم میں شروع ہوا۔ تاہم اگر دوسرے سفر (۶۶۸ ھ) کی روانگی، پہلے سفر (۶۶۷ ھ) کی طرح، اضطراری کیفیت میں نہیں ہوئی تو یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بہتر موسم میں ہوئی ہوگی۔ یہ قیاس گو محض قیاس ہے لیکن سراسر بے بنیاد نہیں۔

تیسرے اور آخری سفر (۶۶۹ ھ) کے بارے میں شواہد یہ نشان دہی کر رہے ہیں کہ یہ موسم سرما (اکتوبر یا نومبر ۱۲۷۰ء) میں شروع کیا گیا۔ یہ شواہد چند صفحات بعد دی ہوئی جدول نمبر (j) سے واضح ہو جائیں گے جس میں خواجہ صاحب کے ان تین سفروں کے بارے میں بعض اہم تاریخیں اور نکات دیئے گئے ہیں۔

جہاں تک سفر کے دورانیے کا تعلق ہے تو ابن بطوطہ کے مطابق دلی سے ملتان کا سفر چالیس دن میں طے ہوتا تھا۔ پاک پتن اور دلی دونوں ملتان کے شمال مشرق میں واقع ہیں۔ ملتان سے پاک پتن ۱۵۰ میل (۲۲۵ کلومیٹر) شمال مشرق میں ہے۔ اس طرح پاک پتن دلی اور ملتان کے درمیان میں واقع ہوا اور ملتان کی نسبت پاک پتن دلی سے تقریباً اتنا ہی قریب تر ہوا اور دلی سے پاک پتن کا سفر چالیس دن سے کم (مثلاً ایک مہینے) کے عرصے میں طے ہو جانا چاہیے۔ تاہم ابن بطوطہ جیسے تجربہ کار اور بادسیلہ جہاں گرد کو سفر کے لیے جو سہولیات اور سواریاں میسر ہوں گی، وہ بھلا تنگ دست اور نوجوان نظام الدین کے پاس کہاں ہوں گی؟ اس وجہ سے یہ قیاس بے بنیاد نہیں کہ خواجہ صاحب کو دلی سے پاک پتن پہنچنے میں ۴۰، ۴۵ روز لگ جاتے ہوں گے اور یہ اس کے باوجود ہوتا ہوگا کہ بابا صاحب کے دیدار کے اشتیاق میں خواجہ صاحب، دلی سے پاک پتن جاتے ہوئے، راستے میں پڑاؤ کا وقفہ کم سے کم رکھتے ہوں گے اور اپنے بیشتر دوستوں اور پیر بھائیوں سے تفصیلی ملاقات پاک پتن سے واپسی کے لیے مؤخر کرتے ہوں گے۔ فوائد الفواد میں اپنے پیر بھائی جمال الدین ہانسوی سے سردیوں میں ملاقات کا ذکر ہے۔ یہ ذکر فوائد الفواد کی دوسری جلد کی نویں مجلس میں ملتا ہے جو ۱۰ ربیع الثانی ۷۱۰ ھ (۶ ستمبر ۱۳۱۰ء) بروز ہفتہ منعقد ہوئی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے اردو ترجمے کے صفحات نمبر ۳۶۷ / اور ۳۶۹ پر، اس ملاقات کا ذکر ان دلچسپ الفاظ میں ہے:

''میں (خواجہ صاحب) ایک دفعہ شیخ جمال الدین ہانسوی رحمتہ اللہ علیہ کے

پاس گیا۔ اشراق کا وقت تھا اور سردی کا موسم ۔ شیخ جمال الدین نے مجھے مخاطب کر کے یہ دو مصرعے پڑھے:

با روغنِ گاؤ اندریں روزِ خنک
نیکو باشد ہریسہ و نانِ تنک

(ترجمہ: آج کے سرد دن گھی، ہریسہ اور پراٹھے ہوتے، تو کیا خوب ہوتا!)

"میں (خواجہ صاحب) نے کہا کہ "ذکر الغائب غیبۃ" یعنی غائب (آدمی یا شے) کا ذکر غیبت ہے۔ شیخ جمال الدین بولے کہ میں نے اس (غائب) کو حاضر کر لیا ہے، تب ہی کہا ہے۔ کہنے کی دیر تھی کہ یہ چیزیں لائی گئیں۔"

ہانسی کا شہر دلّی اور پاک پتن کے درمیان آتا ہے اور یہ ملاقات دلّی سے پاک پتن جاتے ہوئے دوسرے یا شاید تیسرے سفر کے دوران ہوئی ہو۔

جہاں تک پاک پتن میں قیام کے دورانیے کا تعلق ہے تو پہلی اور دوسری حاضری کے بارے میں علم نہیں کہ قیام کتنا رہا، تاہم تیسری حاضری میں قیام کم از کم سوا چار مہینے رہا، کیوں کہ خواجہ صاحب کم از کم ۲۵ جمادی الاولیٰ (۶۶۹ ھ) سے یکم شوال (۶۶۹ ھ) تک پاک پتن میں تھے۔ امکان یہی ہے کہ وہ ۲۵ جمادی الاولیٰ سے پہلے بابا صاحب کا دیدار کرنے پاک پتن پہنچے ہوں گے اور ماہ شوال کے پہلے پندرھواڑے میں کسی روز پاک پتن سے دلّی کے لیے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس طرح قیام کی مدت سوا چار ماہ سے یقیناً زیادہ ہوگی۔

پہلی اور دوسری حاضری میں، پاک پتن میں قیام کے دورانیے کے بارے میں، ایک عام سمجھ بوجھ کا آدمی یہی کہے گا کہ آج سے ساڑھے سات صدی پہلے، جب ایک شخص ماہ، یا ڈیڑھ ماہ کے (اس زمانے کے) سفر کی سختیاں، خطرات اور تھکن

برداشت کر کے دلی سے پاک پتن آئے گا اور پھر دو ڈھائی ماہ کے واپسی کے سفر کی سختیاں، خطرات، تھکن اور اغلباً سخت گرمی برداشت کرتا ہوا پاک پتن سے دلی لوٹے گا، تو وہ پاک پتن میں مہینوں ضرور ٹھہرے گا، خصوصاً جب یہ سفر عشق کا سفر ہو۔ ۶۶۷ ھ، ۶۶۸ ھ اور ۶۶۹ ھ میں موسم گرما اور موسم سرما کے مہینوں کا اندازہ لگانے کے لیے ان تین ہجری سنین سے مطابقت رکھنے والے عیسوی کیلنڈر کے مہینے جدول نمبر (k) میں دیئے گئے ہیں۔ جدول نمبر (j) اور نمبر (k) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ باباصاحب کی حیات میں، خواجہ صاحب، اپنے آخری قیام پاک پتن کے دوران، ۹/ جنوری ۱۲۷۱ء (مطابق ۲۵ جمادی الاولیٰ ۶۶۹ ھ) کو پاک پتن میں تھے۔ اس بنا پر یہ ایک درست قیاس ہوگا کہ خواجہ صاحب نے دلی سے پاک پتن کے لیے اپنے سفر کا آغاز، کوئی ڈیڑھ دو ماہ قبل، سردیوں کے موسم میں کیا ہوگا۔ پاک پتن سے دلی کے واپسی کے سفر کے بارے میں یہ جدولیں نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ سفر مئی کے آخری پندرھواڑے میں، سخت گرمیوں میں، شروع کیا گیا ہوگا اور قوی امکان ہے کہ جون اور جولائی (۱۲۷۱ء) کے پورے مہینے واپسی کے سفر میں گزر گئے ہوں۔

اگر ۲۰ سالہ خواجہ نظام الدین کی پاک پتن میں پہلی حاضری ۶۶۷ ھ میں ہوئی تو اس حساب سے ان کا سنہ ولادت ۶۴۷ ھ ہوا۔ جہاں تک خواجہ صاحب کی پیدائش کے دن اور مہینے کا تعلق ہے، اس میں کبھی کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔ ہم نے پچھلے صفحات میں سیر الاولیاء سے جو سات اقتباسات دیئے تھے، ان میں پہلا اقتباس خواجہ صاحب کی ولادت کے دن (بدھ) اور ولادت کے مہینے (ماہ صفر) کے بارے میں ہے۔ یہ ایک واضح بیان ہے۔ اس کے علاوہ فوائد الفواد کی چوتھی جلد کی چوتھی مجلس میں جو ۲۷ صفر ۷۱۴ ھ (مطابق ۱۲ جون ۱۳۱۴ء) بروز بدھ منعقد ہوئی، اس ضمن میں یہ تحریر ہے:

''اسی سال (۷۱۴ ھ) ماہ صفر کی ستائیسویں تاریخ بدھ کو قدم بوسی کی دولت

حاصل ہوئی۔ اس سے ایک روز پہلے بندے (فوائد الفواد کے مرتّب امیر حسن علا سجزی) نے محترم نصیر الدین محمود (چراغ دہلی) سلمہ اللہ تعالیٰ سے، جو خوش اعتقاد مریدوں میں سے ہیں، مشورہ کیا تھا کہ کل آخری بدھ ہے اور لوگ اس روز کو منحوس سمجھتے ہیں۔ آیئے (اپنے) خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر کی خدمت میں چلیں کیوں کہ وہاں ساری نحوستیں سعادت سے بدل جاتی ہیں۔ غرضیکہ مشورے کے مطابق جب یہ بدھ آیا تو بند۔ اور وہ، دونوں کے دونوں، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر کی خدمت میں پہنچے اور لوگوں کے اس وہم کے بارے میں عرض کیا۔ حضرت نے تبسم فرمایا اور بولے کہ ہاں لوگ اس دن کو منحوس سمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ دن تو بڑا بھاگوان ہے۔ آج کا دن بہت ہی مبارک ہے۔ چنانچہ اگر اس دن فرزند پیدا ہوتا ہے تو وہ بزرگ بنتا ہے۔''

(صفحہ نمبر ۵۹۵۔ فوائد الفواد کا اردو ترجمہ از خواجہ حسن نظامی ثانی دہلوی)

فوائد الفواد کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ تاثر نہیں ملتا کہ امیر حسن علا سجزی اور نصیر الدین محمود چراغ دہلی یہ جانتے بوجھتے کہ ماہ صفر کے آخری بدھ کا دن خواجہ نظام الدین اولیاء کا یوم ولادت ہے، ان کے پاس، پہلے سے باہمی مشورہ کر کے، یہ پوچھنے پہنچے تھے کہ لوگ یہ دن منحوس کیوں سمجھتے ہیں، اور یہ تاثر تو قطعاً نہیں ملتا کہ ان دونوں بزرگوں کو پہلے سے نہ صرف یہ معلوم تھا کہ ماہ صفر کا آخری بدھ خواجہ صاحب کا ''یومِ'' ولادت ہے بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ خواجہ صاحب کی ''تاریخِ'' ولادت بھی ۲۷ صفر ہے اور اسی وجہ سے ان دونوں حضرات نے بدھ ۲۷ صفر (۷۱۴ ھ) کو خواجہ نظام الدین اولیاء سے یہ سوال کرنے کے لیے اس دن اور اس تاریخ کو منتخب کیا۔ فوائد الفواد کے مندرجہ بالا ملفوظات سے یہ تاثر بہر حال ابھرتا ہے کہ خواجہ صاحب نے انتہائی لطیف پیرائے میں یہ اشارہ کیا ہے کہ یہ دن (یعنی ماہ صفر کا آخری بدھ) بہت ہی مبارک دن ہے اور یہ ان کا یومِ ولادت ہے۔ اشارہ دن (بدھ) کی طرف ہے، تاریخ

(۲۷ صفر) کی طرف نہیں۔

ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کا سنہ ولادت ۶۴۷ ھ (مطابق ۱۲۴۹ء) ہے۔ آپ اس سال ماہ صفر کے آخری بدھ کے روز پیدا ہوئے۔ تقویم کے مطابق، ۶۴۷ ھ میں ماہ صفر کے آخری بدھ کو صفر کی پچیس تاریخ نکلتی ہے۔ ۲۵ صفر ۶۴۷ ھ کو اسی تقویم کے مطابق ۹ جون ۱۲۴۹ء تھا۔ تقویم کے مطابق صدیوں قبل کی جو قمری یا عیسوی تاریخیں نکالی جاتی ہیں، وہ قطعی نہیں ہوتیں۔ ان میں ایک آدھ تاریخ آگے پیچھے ہوسکتی ہے۔ خواجہ صاحب کی ولادت کے بارے میں، تاریخی شواہد کی بنا پر صرف تین امور ثابت ہوتے ہیں:

اولاً آپ کی ولادت بدھ کے دن ہوئی۔ ثانیاً آپ کی ولادت ماہ صفر کے آخری بدھ کے دن ہوئی۔ ثالثاً آپ کی ولادت ۶۴۷ ھ کے ماہ صفر کے آخری بدھ کے روز ہوئی۔ گو تقویم کے مطابق یہ تاریخ ۲۵ صفر نکلتی ہے لیکن یہ ۲۶ صفر بھی ہوسکتی ہے (اور اس کا ۲۷ صفر ہونا بھی خارج از امکان نہیں)، اور ۲۴ صفر بھی ہوسکتی ہے تاہم سنہ ۶۴۷ ھ رہے گا اور دن بدھ۔ اسی طرح قمری تقویم کو عیسوی تقویم میں تبدیل کرنے پر یہ تاریخ ۹ جون نکلتی ہے لیکن یہ ۱۰ جون بھی ہوسکتی ہے اور ۸ جون بھی، تاہم عیسوی سنہ ۱۲۴۹ء رہے گا اور دن بدھ۔

خواجہ نظام الدین اولیاء کی ولادت اور وفات دونوں بدھ کے روز ہوئیں اور باباصاحب کی خدمت میں پہلی بار حاضری بھی، ۶۶۷ ھ میں، بدھ کے روز ہی ہوئی۔ کیا ولادت، وصل اور وصال کے لیے قسامِ ازل کی طرف سے بدھ کا دن منتخب کیا گیا تھا، یا اسے محض اتفاق پر محمول کیا جائے گا؟

سطور بالا کی روشنی میں، خواجہ نظام الدین اولیاء کی ولادت اور وفات کی تاریخیں یہ بنتی ہیں:

۶۶۷ھ، ۶۶۸ھ اور ۶۶۹ھ کے مہینوں سے مطابقت رکھنے والے عیسوی سنین

قمری مہینا	۶۶۷ھ (۱۰/ستمبر ۱۲۶۸ تا ۳۰/اگست ۱۲۶۹ء)	۶۶۸ھ (۳۱/اگست ۱۲۶۹ تا ۱۹/اگست ۱۲۷۰ء)	۶۶۹ھ (۲۰/اگست ۱۲۷۰ تا ۸/اگست ۱۲۷۱ء)
محرم	10/9/1268 تا 9/10/1268	31/8/1269 تا 29/9/1269	20/8/1270 تا 18/9/1270
صفر	10/10/1268 تا 7/11/1268	30/9/1269 تا 28/10/1269	19/9/1270 تا 17/10/1270
ربیع الاول	8/11/1268 تا 7/12/1268	29/10/1269 تا 27/11/1269	18/10/1270 تا 16/11/1270
ربیع الثانی	8/12/1268 تا 5/1/1269	28/11/1269 تا 26/12/1269	17/11/1270 تا 15/12/1270
جمادی الاولیٰ	6/1/1269 تا 4/2/1269	27/12/1269 تا 25/1/1270	16/12/1270 تا 14/1/1271
جمادی الثانی	5/2/1269 تا 5/3/1269	26/1/1270 تا 23/2/1270	15/1/1271 تا 12/2/1271
رجب	6/3/1269 تا 4/4/1269	24/2/1270 تا 25/3/1270	13/2/1271 تا 14/3/1271
شعبان	5/4/1269 تا 3/5/1269	26/3/1270 تا 23/4/1270	15/3/1271 تا 12/4/1271
رمضان	4/5/1269 تا 2/6/1269	24/4/1270 تا 23/5/1270	13/4/1271 تا 12/5/1271
شوال	3/6/1269 تا 1/7/1269	24/5/1270 تا 21/6/1270	13/5/1271 تا 10/6/1271
ذی قعدہ	2/7/1269 تا 31/7/1269	22/6/1270 تا 21/7/1270	11/6/1271 تا 10/7/1271
ذی الحج	1/8/1269 تا 30/8/1269	22/7/1270 تا 19/8/1270	11/7/1271 تا 8/8/1271

	ولادت	وفات	عمر
دن	بدھ	بدھ	قمری تقویم سے: ۸۷ برس
وقت	نہیں معلوم گو بعض روایات میں طلوعِ آفتاب بیان کیا گیا ہے۔	تقریباً سات بجے صبح	عیسوی تقویم سے: تقریباً ۷۶ برس
تاریخ	اغلباً ۲۵ صفر مطابق ۹ جون	۱۸ ربیع الثانی / اغلباً ۳/اپریل	
سنہ	۶۴۷ھ/ ۱۲۴۹ء	۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء	

بابا صاحب کی حیات میں خواجہ صاحب کی پاک پتن میں حاضریوں کے بارے میں اہم تاریخیں اور کوائف

دیکھیے ''جدول نمبر (J)''

۶۶۷ھ، ۶۶۸ھ اور ۶۶۹ھ کے مہینوں سے مطابقت رکھنے والے عیسوی سنین۔

دیکھیے ''جدول نمبر (K)''

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ سے ایک مختصر تعارف

کسی عظیم شخصیت سے تعارف کے لیے ہمیں پہلے اس دور کا شعور ہونا چاہیے جس میں اس شخصیت نے اپنی عمر گزاری ہو۔ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ ۱۱۸۰ء اور ۱۲۷۱ء کے درمیان تقریباً نوّے برس اس دنیا میں رہے۔ نوّے برس کا یہ دور تاریخ میں قرونِ وسطیٰ یعنی MIDDLE AGES کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب وغریب دور تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کی دنیاوی حکومت ایسی پستیوں میں گری جن کی مثال تاریخ میں کم ہی ملے گی۔ دوسری طرف اسلام کی روحانی سلطنت نے عروج کی ان رفعتوں کو چھوا جن کی مثال تاریخ میں کم ہی ملے گی۔ یہ وہ دورِ ابتلاء تھا جب بغداد میں صدیوں سے قائم خلافتِ عباسیہ اور قُرطبہ میں صدیوں سے قائم خلافتِ اُمویہ کا نام ونشان مٹ گیا۔ یہی وہ دور تھا جب چنگیز خان ۱۱۶۲ء میں، یا اس کے لگ بھگ، منگولیا میں پیدا ہوا۔ بابا صاحب اس کے ۱۸ برس بعد ملتان کے نزدیک واقع ایک قصبے ''کوٹھے وال'' یا ''کھتوال'' میں پیدا ہوئے۔ ملتان سے دس میل (یا سترہ کلومیٹر) شمال مشرق میں آج بھی ''کوٹھے وال'' کے نام سے ایک قصبہ موجود ہے۔ جب چنگیز خان ۱۲۲۷ء میں مرا تو بابا صاحب ۴۷ سال کے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۹۳ء میں وفات پائی۔ بابا صاحب اس وقت تیرہ برس کے لڑکے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو، شاہ انگلستان جان (JOHN) نے میگنا کارٹا (MAGNA CARTA) پر مہر شاہی ثبت کی۔ جب انگلستان میں رَنی میڈ کے مقام

پر اس دستاویز پر مہرِ شاہی ثبت کی جا رہی تھی، تو بابا صاحب ۳۵ برس کے جوان تھے۔ اس وقت روم میں مشہور پوپ اِنوسِنٹ سویم (INNOCENT-III) پاپائے روم تھا۔ کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ شاہ انگلستان جان کی درخواست پر اس مشہور پوپ نے میگنا کارٹا کو منسوخ قرار دیا تھا۔ ۱۲۳۶ء میں جب سپین میں مسلم حکومت کے دار السلطنت قرطبہ سے مسلمانوں کی حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہوئی، اس وقت بابا صاحب ۵۶ برس کی ادھیڑ عمر میں داخل ہو چکے تھے اور ۲۲ برس بعد، فروری ۱۲۵۸ء میں، جب ہلاکو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو بابا صاحب ۷۸ برس کے بوڑھے تھے۔

بغداد اور قرطبہ صرف مسلم حکومتوں کے دار الخلافے نہ تھے بلکہ مشرق اور مغرب میں نہ صرف مسلم تہذیب وتمدن بلکہ بین الاقوامی علوم اور فنون کے مراکز تھے۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ایک طرف مشرق اور مغرب میں عقل اور علم کے یہ قدیم مراکز اجڑ رہے تھے اور دوسری طرف ،اُسی دَور میں، ۱۲۴۹ء میں، اُدھر مغرب میں، آکسفورڈ کے مقام پر، انگلستان کا پہلا کالج ''یونیورسٹی کالج آکسفورڈ'' کے نام سے قائم ہو رہا تھا اور، اِدھر مشرق میں، بابا صاحب تقریباً ستر برس کی عمر میں، پاک پتن میں جو اس وقت اجودھن کہلاتا تھا، عقل، علم اور عشق کے اس بین الاقوامی مرکز کی بنیاد رکھ رہے تھے جو بابا صاحب کا جماعت خانہ کہلایا۔ یہی وہ دور تھا جب ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے یروشلم فتح کیا جو اس کے بعد تقریباً آٹھ صدی کے بیشتر حصے میں ۱۹۶۷ء تک مسلمانوں کے پاس رہا۔ یہی وہ دور تھا جس میں، ۱۱۸۹ء میں، تیسری صلیبی جنگ کا آغاز ہوا جس میں انگلستان کا بادشاہ رچرڈ شیر دل شریک تھا۔ اور سب سے آخر میں یہ بات کہ یہ ہی وہ دور تھا جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے، ۱۱۹۳ء میں، ترائن کے مقام پر، اجمیر اور دلّی کے راجہ پرتھوی راج کو شکست دے کر دلّی پر قبضہ کرلیا۔

۱۱۹۳ء ہی وہ سال تھا جب صلاح الدین ایوبی کا وصال ہوا۔ اس وقت بابا صاحب تیرہ برس کے لڑکے تھے۔ ۱۲۰۶ء میں محمد غوری کے نامی گرامی غلام اور جنرل قطب الدین ایبک نے سلطنت دہلی کی بنیاد رکھی۔ ایبک کے بعد مشہور سلاطین دہلی میں التمش، رضیہ سلطانہ، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے نام آتے ہیں۔

بلبن ۱۲۶۶ء میں سلطان دہلی بنا اور بابا صاحب نے بلبن کے ابتدائی دورِ سلطانی میں، وسط اگست ۱۲۷۱ء میں، اکیانوے برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس عہد کا مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی تاریخ کی اپنی مشہور کتاب "تاریخ فیروز شاہی" میں لکھتا ہے:

> "یہ عہد ایسے مشائخ کی موجودگی سے مزیّن اور مشرف تھا کہ ان جیسی ہستی مدت میں ایک پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اس (یعنی بلبن) کے عہد کے ابتدائی دور میں شیخ شیوخ العالم فرید الدین مسعود بہ قید حیات تھے۔ وہ قطبِ عالم اور مدارِ جہاں تھے۔ اس خطۂ زمین کے لوگوں کو انہوں نے اپنی پناہ اور (اپنے) سائے میں لے لیا تھا......
> ان کے قرب اور برکتِ انفاس کی وجہ سے لوگ دین ودنیا کی مصیبتوں سے نجات پاتے تھے اور جو اس کے اہل تھے، (وہ) ان کی اِرادت کے ذریعے بلند مراتب حاصل کرتے تھے۔"

ضیاء الدین برنی کے یہ دل نشین اور مشہور فقرے پڑھ کر، ہماری نظر بے ساختہ زمین سے اٹھ کر، تصوّف کے آسمان پر پڑتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آسمانِ تصوّف پر اتنے چمکتے دمکتے ستارے نہ کبھی پہلے، ایک ساتھ، اس آب وتاب سے نظر آئے اور نہ بعد میں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جیسے بعض زمینیں زرخیز ہوتی ہیں، ویسے ہی بعض زمانے بھی مردم خیز ہوتے ہیں۔ یہ دور ایک انتہائی مردم خیز دور تھا۔ بابا صاحب کے تیرہ مشہور ہم عصر صوفیہ کے نام یہ ہیں:

(۱) محی الدین ابنِ عربی

(۲) جلال الدین رومی

(۳) شیخ سعدی

(۴) شہاب الدین سہروردی

(۵) لال شاہ باز قلندر (سہون)

(۶) بہاء الدین زکریا (ملتان)

(۷) جلال الدین بخاری (اوچ)

(۸) معین الدین چشتی

(۹) قطب الدین بختیار کاکی

(۱۰) نظام الدین اولیاء

(۱۱) علاء الدین صابر (کلیر)

(۱۲) فرید الدین عطاؔر

(۱۳) ابوالحسن علی الشاذلی

اس دور کے چودھویں عظیم بلکہ عظیم ترین صوفی عبدالقادر جیلانی کا نام بزمِ صوفیہ کی اس فہرست میں صرف اس لیے شامل نہیں کیا گیا کیوں کہ ان کا وصال باباصاحب کی ولادت سے تیرہ چودہ برس پہلے ہوگیا تھا۔ غور کیجیے کہ اسلامی تصوف کے عظیم سلسلوں میں سے دو یعنی ''قادریہ'' اور ''شاذلیہ'' سلسلوں کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ ابوالحسن علی الشاذلی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ دو عظیم سلسلوں یعنی چشتیہ اور سہروردیہ کے مشہور ترین صوفیہ یعنی خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ شہاب الدین سہروردی بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ برّصغیر پاک وہند سے باہر ابنِ عربی، جلال الدین رومی، شیخ سعدی اور فرید الدین عطاؔر جیسے شہرۂ آفاق نام، اور برّصغیر میں

سہون کے لال شاہ باز قلندر، ملتان کے بہاء الدین زکریا، اُوچ کے جلال الدین بخاری اور چشتیہ سلسلے کے قطب الدین بختیار، نظام الدین اولیاء اور کلیر کے علاء الدین صابر سب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا دور پہلے آیا، نہ بعد میں۔ دنیا کے بادشاہوں کی بربادی کا یہ دور دین کے شہنشاہوں کی تاجداری، اور سلطنتوں کی تباہی کا یہ زمانہ خانقاہوں کی آبادی کا دور تھا۔

ایک عظیم صوفی یا پیغام بَر کا پیغام اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اس کی شخصیت اس کے پیغام میں مضمر ہوتی ہے۔ شخصیت سے صحیح معنوں میں شناسائی ہوگئی تو سمجھ لیجیے کہ پیغام تک رسائی ہوگئی۔ پیغام دل میں اتر گیا تو جان جائیے کہ شخصیت کے حضور میں حاضری ہوگئی اور نصیب یاور ہے تو حاضری سے حضوریِ قلب بھی مل گئی۔ ۱۹۹۸ء میں، مجھے زندگی میں پہلی بار ضلع شیخو پورہ کے قصبے ننکانہ صاحب جانے کا موقع ملا۔ یہ قصبہ گرو نانک کی جائے پیدائش ہے اور سکھوں کو اس مقام سے وہی عقیدت ہے جو مسلمانوں کو مکّے مدینے سے ہے۔ یہاں سکھوں کا ایک مقدس ترین قدیم گردوارہ ہے۔ جب میں اس گردوارے کی مختلف غلام گردشوں اور چھوٹے بڑے کمروں میں گردش کرتا، گردوارے کے عین وسط میں پہنچا تو چاندی کے ستونوں پر رکھی ہوئی ایک خوب صورت چھتری نظر آئی جس کے نیچے چاندی کے ورقوں میں لپٹی ایک عظیم الجثہ کتاب بہت اہتمام سے رکھی تھی جو گرمکھی رسم الخط میں تھی۔ یہ سکھوں کی مقدس مذہبی کتاب ''گرنتھ صاحب'' تھی اور چاندی جیسی سفید ڈاڑھی والا ایک سکھ اسے بہت عقیدت سے اپنی پاٹ دار آواز میں پڑھ رہا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھ رہا تھا، وہ بابا صاحب سے منسوب بابا صاحب کا پنجابی کلام تھا جسے سنسکرت میں ''شلوک''، ہندی میں ''اشلوک'' اور اردو میں ''شعر'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ اشلوک قدیم ملتانی یا سرائیکی زبان میں تھا اور گرنتھ صاحب میں اس کا نمبر ''۱۹'' ہے۔ اشلوک کے الفاظ یہ ہیں:

جنگل جنگل کیا بھوَیں؟ وَن کنڈا موڑیں

وسی رَب ہیالیے، جنگل کیا ڈھونڈیں

منظوم اردو ترجمہ

''جنگل جنگل پھرتا ہے، کانٹوں کو تو روندتا ہے

رب تو بسے ہے مَن میں ترِے، جنگل میں کیا ڈھونڈتا ہے؟''

اللہ کو پانے کا یہی وہ رستہ ہے جو مختلف زمینوں، زمانوں اور زبانوں میں اللہ جانے کب سے بتایا جاتا رہا ہے، گرو نانک نے بابا صاحب سے منسوب اس مشہور اشلوک کو گرنتھ صاحب میں شامل کر کے، اس شعر کو سکھ مذہب میں وہی مقام دے دیا جو مسلمان قرآنی آیات کو دیتے ہیں۔

گرنتھ صاحب میں بابا صاحب سے منسوب کل ۱۱۲/ اشلوک ہیں جو گرنتھ صاحب کے ایک علیحدہ باب میں درج ہیں جس کا خصوصی عنوان ہے: ''شلوک فرید جی کے''۔ بابا صاحب سے منسوب ایک اور اشلوک جو گرنتھ صاحب کا اشلوک نمبر ۲۸ ہے، یہ ہے:

روٹی میری کاٹھ کی، لاوَن میری بھکھ

جھاں کھادی چوپڑی، گھنَے سہن گے دُکھ

اس کا منظوم اردو ترجمہ یہ ہوسکتا ہے:

روٹی میری کاٹھ کی اور سالن میرا، بھوک

جو چکنی چپڑی کھاتا ہے، وہ دکھ بھی بہت اٹھاتا ہے

بابا صاحب کا اسی مفہوم کا ایک اور اشلوک، گرنتھ صاحب کا اشلوک نمبر ۲۹ ہے جس کے الفاظ اتنے عام فہم ہیں کہ آج کا انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ کیا سولھویں صدی عیسوی کی گرنتھ صاحب میں شامل یہ اشلوک واقعی اتنی صدیوں پرانا ہوسکتا ہے؟

اشلوک یہ ہے:

رُکھی سُکھی کھاءِ کے ٹھنڈا پانی پیءِ

دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی

ان اشلوکوں کی عملی تفسیر بابا صاحب خود تھے۔ انہیں اپنے خالق سے عشق، اس کی مخلوق سے پیار اور دنیاوی دولت سے نفرت تھی۔ زندگی بھر طرح طرح کے تحائف پیش ہوتے رہے لیکن انہیں رات تک رکھنے کی اجازت نہ تھی کیوں کہ یہ اللہ پر توکل کے اس معیار کے خلاف تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی کی ہم عصر اجودھن کی اس یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سبق تھا۔

اور اجودھن کی یہ یونیورسٹی تھی کیا؟ گارے اور کچی اینٹوں سے بنا ایک بڑا سا کمرہ جس کی بنیادیں کعبہ مشرفہ کی طرح انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں رکھی گئیں۔ اس لمبے سے کچے کمرے میں نہ صرف بّرصغیر پاک وہند بلکہ دوسرے ممالک کے صوفیہ، علماء اور بزرگانِ باصفا روکھی سوکھی کھاتے، ٹھنڈا پانی پیتے اور اپنے مَن میں بسے اپنے رب کو تلاش کرتے۔ تَن پر موٹے جھوٹے کپڑے، سَر منڈے ہوئے، کچی زمین پر ساتھ ساتھ بستر، ہاتھوں میں کتابیں، دماغ میں رب کا تصور، دل میں رب کی یاد، زبان پر رب کا نام اور منہ میں روزہ۔ راتیں ذکر وفکر میں کٹتیں۔ سورج چڑھتا تو سب اپنے اپنے کام دھندے سے لگ جاتے۔ کوئی پانی بھر کرلاتا۔ کوئی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا۔ کوئی برتن دھوتا۔ کوئی جنگلی پھول پھل اور پتے توڑ کر لاتا۔ کوئی انہیں پانی میں ابال کر کبھی نمکین اور کبھی بلا نمک کا سالن پکاتا۔ گندم کا آٹا مل جاتا تو اس کی روٹیاں پک جاتیں۔ نہ ملتا تو جوار کی موٹی موٹی روٹیوں پر ہی گزارا ہوجاتا۔ دستر خوان ہوتا تو اسے زمین پر بچھا کر کھانا اس پر چُن دیا جاتا۔ نہ ہوتا تو ان اللہ والوں کے لیے اللہ کی زمین ہی دستر خوان کا کام دیتی۔ ہر ایک زمین پر زانو سے زانو ملا کر بیٹھتا۔ ہر ایک کو برابر کا

کھانا ملتا۔ تخصیص کھانے میں ہوتی، نہ کھلانے میں نہ بٹھانے میں۔

سچ تو یہ ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں، اس پورے برّصغیر میں، اگر زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا تھا جہاں شاہ اور گدا سب کا ایک جیسا استقبال اور سب سے ایک سا سلوک ہوتا تھا، تو وہ پنجاب کے اس دور اُفتادہ، ریتیلے اور گرم قصبے کے جماعت خانے اور اس کے ارد گرد کی یہ چند سَو مربع گز زمین تھی۔ یہ ایک اقامتی یونیورسٹی تھی جہاں نہ صرف تعلیم بلکہ تربیت، تجربہ، خوراک اور رہائش سب مفت تھیں۔ اس یونیورسٹی کی تعلیم کا نصاب عقل، علم اور عشق تھے۔ یہاں کی تعلیم کا مقصد کسی ڈگری کا حصول تھا نہ کسی ملازمت کا۔ اس تعلیم کا واحد مقصد اس شمع کے نور اور اس کی حرارت کو زیادہ سے زیادہ جذب کرنا تھا جس کے دم سے درویشی کے اس سلسلے کا ابد تک قائم رہنا ازل سے مقدر ٹھہرایا جا چکا تھا۔

فرید الدین مسعود گنج شکر اپنی مدھم، ملائم، میٹھی، موہنی اور مدھ بھری آواز میں، ٹھہر ٹھہر کر، بعض اوقات دہرا دہرا کر، قرآن، حدیث، تصوف اور اسلامی قوانین کے انتہائی پیچیدہ مسائل یوں سمجھاتے کہ یہ اَبدال اور نابغہ روزگار علماء اور فضلاء جو یہاں طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھے، عَش عَش کر اٹھتے۔ ان کا کہا اللہ کا کہا ہوتا تھا، گو وہ اللہ کے بندے کی زبان سے ادا ہو رہا ہوتا تھا۔ اور پھر تعلیم خالی زبان سے تو نہ تھی، سب سے بڑا معلّم تو شیخ الجامعہ یعنی یونیورسٹی کے چانسلر کا اپنا کردار تھا۔ شفاف آئینے کی طرح ایک ایسا کردار جس میں عمر بھر ظاہر اور باطن میں ذرہ بھر فرق نہیں رہا۔ کھرے سونے کی طرح ٹھوس، پائیدار اور اندر باہر سے یکساں چمکیلا۔ اور سب سے آخر میں اس تعلیم کا ذریعہ وہ باطنی توجہ تھی جو شیخ الجامعہ اپنے طالب علموں پر کرتے رہتے۔ نظر نہ آنے والی برقی شعاعیں شیخ کی آنکھوں سے، اور محسوس نہ ہونے والی مقناطیسی لہریں شیخ کے دل اور دماغ سے نکلتیں اور تیر کی طرح مریدانِ باصفا کے قلب ونظر میں پیوست ہو جاتیں اور

پھر وہ سَر مَدی سفر شروع ہو جاتا جہاں انسان تزکیہ نفس، تصفیہ قلب، تجلیہ روح اور تخلیہ روح وقلب کی اُرفع منازل طے کرتا، فنا سے بقا، مکاں سے لامکاں، بے خودی سے خودی اور خودی سے بے خودی کی اس نا قابلِ بیان لذت سے سرشار ہوتا ہے جہاں وہ خود کو پہچان کر، سیدھا خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

خدا نے انہیں وہ چشم بینا عطا کی تھی کہ چہرے پر سرسری نظر ڈالتے ہی دل کی تہ تک پہنچ جاتے اور بعض اوقات یہ کام نظر ڈالے بغیر بھی ہو جاتا۔ ان کی صحبت میں آدمی انسان بن جاتا جس کا بننا فرشتے سے بہتر مگر اس سے کہیں مشکل ہوتا ہے۔ دہلی کی اعلٰے ترین درس گاہوں کے سند یافتہ یہ علماء اور فضلاء جب اجودھن کے جماعت خانے کے کچے فرش پر بیٹھ کر، جس کی بُھر بُھری مٹی کی سوندھی مہک، شیخ کی گفتگو کی بھینی خوشبو سے مل کر فضا کو ہر لمحے معطر کیے رہتی، گنجِ شکر کی شکر بار زبان سے بڑے بڑے مسائل کا حل، چھوٹے چھوٹے سیدھے سادے جملوں میں سنتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا کسے کہتے ہیں۔

آپ کا قول ہے کہ تدبیر میں نقصان اور تسلیم میں سلامتی ہے۔ قول مختصر لیکن اس کی گہرائی قابلِ غور ہے۔ جتنا غور کریں گے، اتنی ہی گہرائی پاتے جائیں گے۔ ایک مرتبہ کسی نے چھری پیش کی تو فرمایا: مجھے چھری نہ دو، سوئی دو کہ میں کاٹتا نہیں، سیتا ہوں۔ یہ ایک فقرہ نہیں بلکہ ان کی عظیم شخصیت کا فوٹو ہے۔ یہ ایک سمندر ہے جو کوزے میں بند ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ سات سو بزرگانِ دین سے چار سوال کیے گئے، سب نے ایک سا جواب دیا۔ سوالات اور جوابات یہ تھے:

	سوال	جواب
۱	سب سے عقل مند کون ہے؟	جو دنیا چھوڑ دے۔
۲	سب سے مال دار کون ہے؟	جو قانع ہے۔
۳	سب سے مفلس کون ہے؟	جو قانع نہیں ہے۔
۴	سب سے ولی صفت کون ہے؟	جو کسی سے متغیر نہ ہو۔

جب ان سوالات کا مجسم جواب، سننے والوں کے عین سامنے بیٹھا اپنی میٹھی اور مدھم آواز میں، ٹھہر ٹھہر کر، یہ جوابات دے رہا ہو، تو کون ہے جس کے دل اور دماغ کی گہرائیوں میں ہر جواب نقشِ دوام کی طرح ثبت نہ ہو جائے۔

جیسے انسان کا رَب ہر گھڑی اپنے بندے یا بندی کے ساتھ ہوتا ہے، ویسے ہی جو اپنے رب کا دوست ہوتا یا ہوتی ہے، وہ ہر گھڑی اور ہر صدی میں ہر انسان کا دوست ہوتا یا ہوتی ہے جس میں قوم، نسل، عقیدے، زبان، جنس، رنگ، عمر اور ذات پات کی قید نہیں ہوا کرتی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ہر انسان اپنے دوست کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اس انسان دوست درویش کی ذاتِ والا صفات کی زندگی کا ایک عام دن یعنی (Typical Day) کیسے گزرتا تھا، اس کی ایک جھلک اس تحریر کا آخری اور خوشگوار حصہ ہے۔

بابا صاحب کم بولتے، بہت کم اور بہت سادہ کھاتے اور بہت ہی کم سوتے تھے، رات جب سارا سنسار سو رہا ہوتا، وہ جاگ رہے ہوتے۔ اجودھن کی تاریک رات کے مکمل سناٹے میں، وہ کبھی بے قراری کے عالم میں، اپنے ہاتھ پیچھے باندھے، اپنے اس چھوٹے سے کچے حجرے میں چہل قدمی کرنے لگتے جہاں وہ آج بھی آرام فرما ہیں۔ وہ اپنی مدھم، میٹھی، ملائم، مدھ بھری اور من موہنی آواز میں، چپکے چپکے، سرگوشیوں میں، اپنے محبوب سے کہتے:

''میرے محبوب! میری بس ایک ہی آرزو رہ گئی ہے کہ جب تک جیوں، صرف تیری یاد میں جیوں اور جب مروں تو تیرے قدموں میں گر کر تجھے دیکھنے کے لیے زندہ ہو جاؤں۔ مجھے بتا تو سہی کہ دونوں جہاں میں تیرے سوا میرا بھلا اور کون ہے؟ میں جیتا ہوں تو صرف تیرے لیے، مرتا ہوں تو صرف تیرے لیے۔''

رات جیسے جیسے ساکت اور ساکن ہوتی جاتی، ان کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ وجد کا عالم طاری ہو جاتا۔ حجرے میں رقص کرنے لگتے۔ رات اور ساکت، اور ساکن ہو جاتی۔ جب رب المشرقین والمغربین اپنے کسی بندے یا بندی پر اپنے فضل کی بوچھاڑ کرتا ہے تو یہی ہوا کرتا ہے۔ یہ وجد ایک فرد پر طاری ہوتا تھا، نہ یہ رقص ایک فرد کا ہوتا تھا۔ یہ وجد ایک عالم پر اور یہ رقص، رقصِ کائنات ہوتا تھا جس میں سب دوئیاں ختم اور ساری دُوریاں دور ہو جاتی تھیں۔

رات ختم ہوتی، سحری کا وقت آتا۔ فرید الدین مسعود کی سحری کیا ہوتی تھی؟ صرف اور صرف روزے کی نیت۔ فجر کی اذان بلند ہوتی تو نیچی چھت والے اس چھوٹے سے کچے حجرے کا لکڑی کا دروازہ ہولے سے کھلتا۔ تاروں کی چھاؤں اور سحر کی ٹھنڈی ہواؤں میں وہ باہر آتے۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم، نکلتا ہوا قد، صحت مند جسم، گندمی رنگ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی روشن آنکھیں، چوڑے کندھے، فراخ سینہ، شب بھر کے رَت جگے کے باوجود تر و تازہ گلاب کی مانند کِھلا ہوا شاداب اور بھرا بھرا چہرہ جس سے نور بھی چھلکتا تھا اور جس سے دبدبہ بھی ٹپکتا تھا، جسے دیکھ کر کشش بھی محسوس ہوتی تھی اور رعب بھی طاری ہوتا تھا۔ جمال اور جلال کا حسین امتزاج۔ چاندی اور چاندنی کی طرح سفید براق ڈاڑھی جو رخساروں پر چھدری اور ٹھوڑی پر گھنی تھی۔ ایک کرشماتی شخصیت جسے ایک بار دیکھ کر دوسری بار، دوسری بار دیکھ کر تیسری بار اور پھر بار بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا اور کبھی

جی نہ بھرتا تھا۔ اپنی شکر جیسی میٹھی آواز میں، گنجِ شکر اللہ کی مخلوق کو دعائیں دیتے، ان پر سلامتی بھیجتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے حضور چپکے چپکے سلام پیش کرتے، اپنے اکلوتے محبوب کے نشے میں چوُر، اُس ہی کی دُھن میں مگن، وقار سے آہستہ آہستہ نپے تلے قدم اٹھاتے، فجر کی نماز کی امامت کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہوجاتے۔ سیکڑوں مشتاق نظریں ان کی سر سے پاؤں تک بلائیں لیتیں، سیکڑوں باادب ہاتھ ایک ساتھ سلام کے لیے اٹھتے۔ کتنی آنکھیں تھیں جو بھیگ جاتیں، اور وقت تھم جاتا کہ اللہ اکبر! امامت کے لیے امامِ وقت خود چلا آرہا ہے۔

نماز کی دو رکعتیں کیا پڑھاتے، دلوں کی دنیا ہی بدل ڈالتے۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے رَب سے اور ان کا رَب ان سے باتیں کررہا ہے۔ اسی وجہ سے انہیں نماز پڑھتے دیکھ کر، دیکھنے اور پڑھنے والوں پر دیر تک عجیب سی کیفیت طاری رہتی۔ ان کی نماز جنت کی آرزو میں ہوتی نہ جہنم کے ڈر سے۔ وہ تو صرف اس ایک ذات کے لیے ہوتی جو ان کی نس نس میں بسا ہوا تھا۔ اس نماز میں ان کا جسم ہی نہیں، ان کا خیال بھی اس ذات کے حضور سجدہ ریز ہوتا جو ساری عمر ان کی زندگی کا مرکز اور محور رہی۔ نماز ختم ہوتی تو وہ آہستہ سے اپنے پھٹے پرانے مصلّے سے اٹھتے اور نپے تلے قدم اٹھاتے، اپنے محبّ اور محبوب کی دُھن میں گم، اس کی مخلوق کی توجہ کا مرکز بنے، ان کی امیدوں کا سہارا، ان کے غموں کا مداوا اور ان کے درد کا مسیحا بنے، اپنے اسی حجرے میں واپس پہنچ جاتے جہاں وہ آج آرام فرما ہیں۔ یہ آرام گاہ ایک مزار نہیں بلکہ مرکزِ عشق ہے جہاں آتے تو سب ہیں لیکن جہاں انتظار عاشقوں کا رہتا ہے۔

کچے حجرے میں جاتے ہی، لکڑی کا دروازہ اندر سے بند کردیا جاتا اور اگلی دو گھڑی انسان تو انسان کسی فرشتے کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ وقت اس ایک ذات کے آگے اس ایک لمبے سجدے کے لیے وقف تھا جب مسعود اور اس کے معبود کے

درمیان کسی غیر خیال کو غلطی سے بھی گزرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہی وہ سجدہ ہے جو قدسی مقال اقبال کے لافانی اور لاثانی الفاظ میں، آدمی کو ہزار سجدوں سے آزاد کرتا ہے، جس میں اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دوست کے آگے رو رو کر کہا کرتے تھے:

''تیرے آگے میرا تمام جسم اور خیال بھی سجدہ کرتا ہے۔''

ظہر کی نماز کے بعد، حجرے کا دروازہ کھول دیا جاتا۔ اللہ سے باتیں بہت ہو گئیں۔ اب وقت اللہ کے بندوں کے کام کرنے کا تھا۔ لوگ ایک ایک کر کے، باری باری، اندر آتے جاتے اور اپنی مشکلات اور مسائل بتاتے جاتے۔ کسی کو اپنی جوان بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ کوئی کسی سرکاری افسر کے جبر کا شکار تھا۔ کسی کو سرکار دربار تک رسائی درکار تھی۔ کسی کا کوئی بھائی قریب الموت تھا۔

آپ پوری یکسوئی اور ہمدردی سے ہر ایک کی پوری بات سنتے اور جب تک بات ختم نہ کر لیتا، روکتے نہ ٹوکتے۔ ہر ایک کی بپتا یوں سنتے جیسے یہ اُس پر نہیں، اُن پر بیت چکی ہو۔ ہر ایک کی دل جوئی کرتے۔ ہر ایک کی فوری اور پوری مدد کرتے۔ ان جیسا پیار بہتوں کو اپنوں میں نہ ملتا تھا۔

بابا صاحب کے پاس جو بھی آتا، کچھ لے کر جاتا اور جو بھی آتا کچھ لے کر آتا جو شام ڈھلے تک اجودھن کے غرباء اور مستحقین میں تقسیم ہو جاتا۔ کوئی خالی ہاتھ آتا تو حکم تھا کہ آنے والا خالی ہاتھ آ تو گیا ہے، خالی ہاتھ واپس نہ جائے۔ سخی کے دربار کی یہ ریت اور شاہانہ روایت آج بھی قائم ہے۔ دربار سے خالی ہاتھ واپس آنے کی اجازت تب تھی، نہ اب ہے۔

کبھی کسی حاجت مند سے اپنے مخصوص میٹھے لہجے میں آہستہ سے کہتے: ''جاؤ، شکرانہ لے آؤ'' یہ اشارہ ہوتا کہ دعا قبول ہو گئی۔ اگر کبھی سائلوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے، ہر سائل سے فرداً فرداً ملنا محال نظر آتا تو حجرے سے باہر آ جاتے اور بلند آواز میں
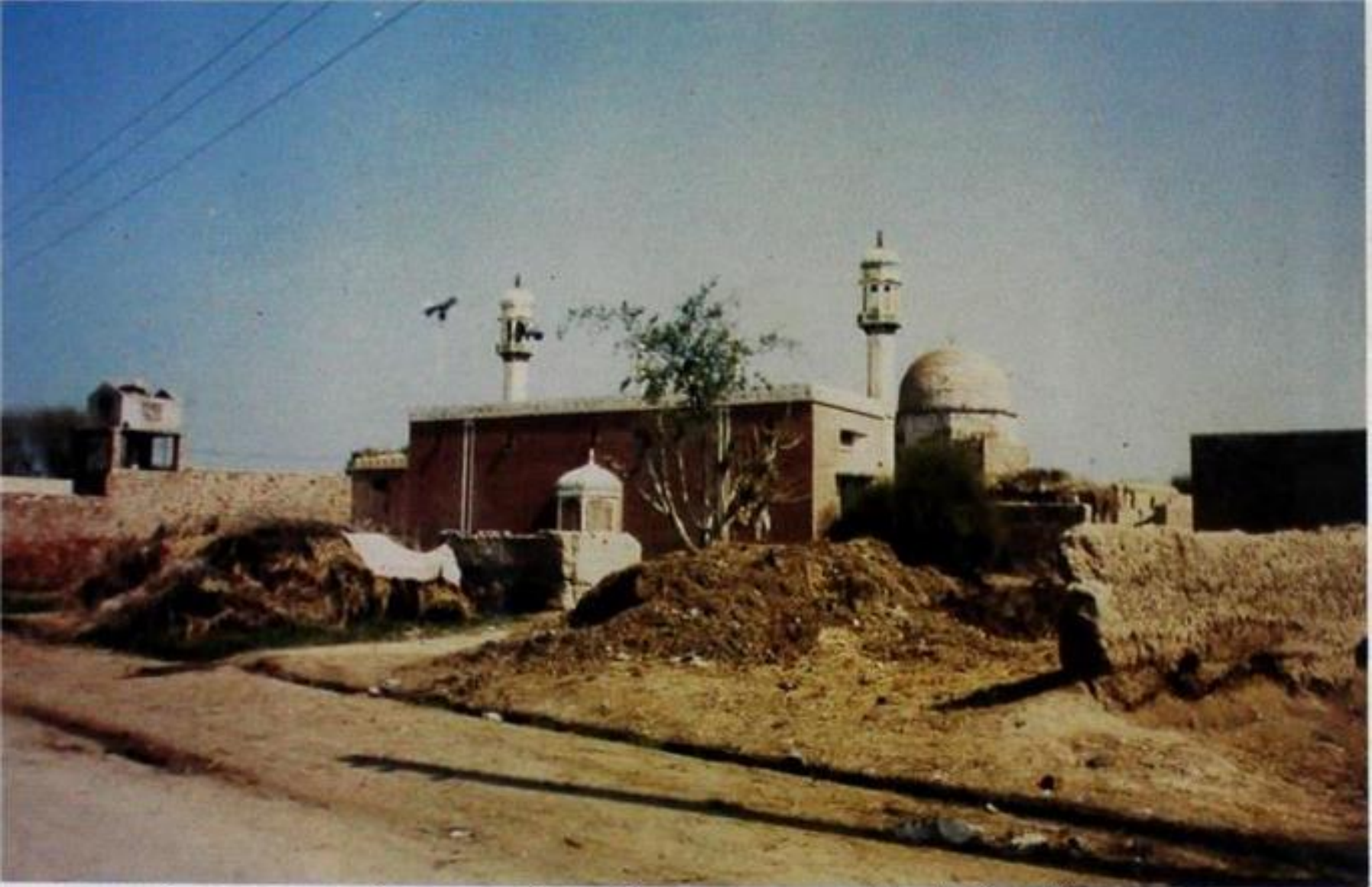
ملتان سے دس میل دور کوٹھے وال نامی قصبہ ہے۔ اس کی مسجد کے عقب میں فریدالدین مسعود کے والد سے منسوب ایک نو تعمیر مقبرہ ہے۔
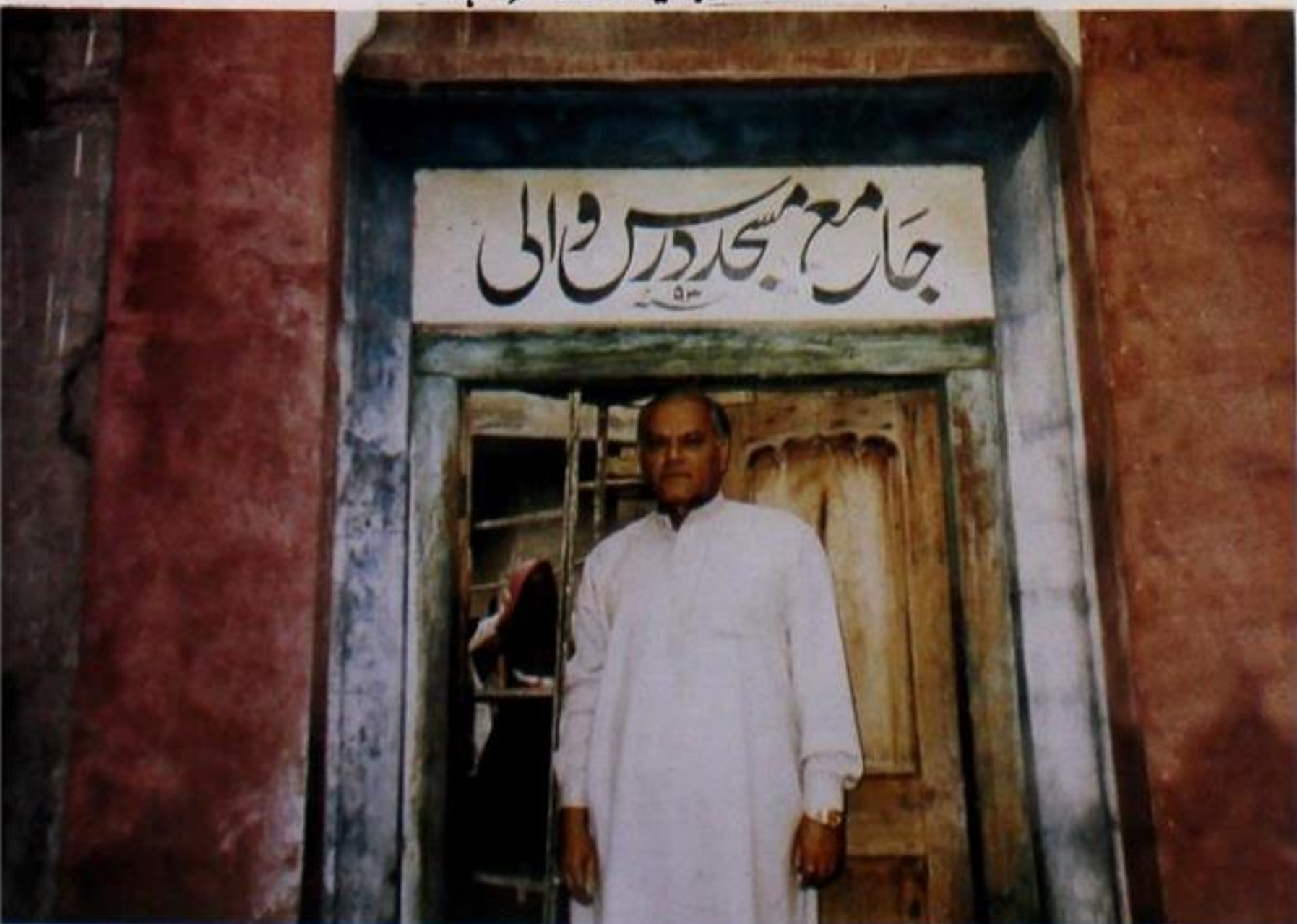
جامع مسجد درس والی

ملتان کے تاریخی قلعے کے دامن میں، "جامع مسجد درس والی" کے نام سے ایک مسجد ہے جس کے دروازے پر اس کا سال تعمیر ۹۳ھ رقم ہے۔

ضلع بہاولپور کے شہر اوچ میں واقع وہ کنواں جس کے بارے میں روایت ہے کہ فرید الدین مسعود نے اس میں چلہ کھینچا تھا۔ دائیں طرف کنویں کا منہ اور بائیں طرف ''مسجد حاجات'' کا دروازہ ہے۔
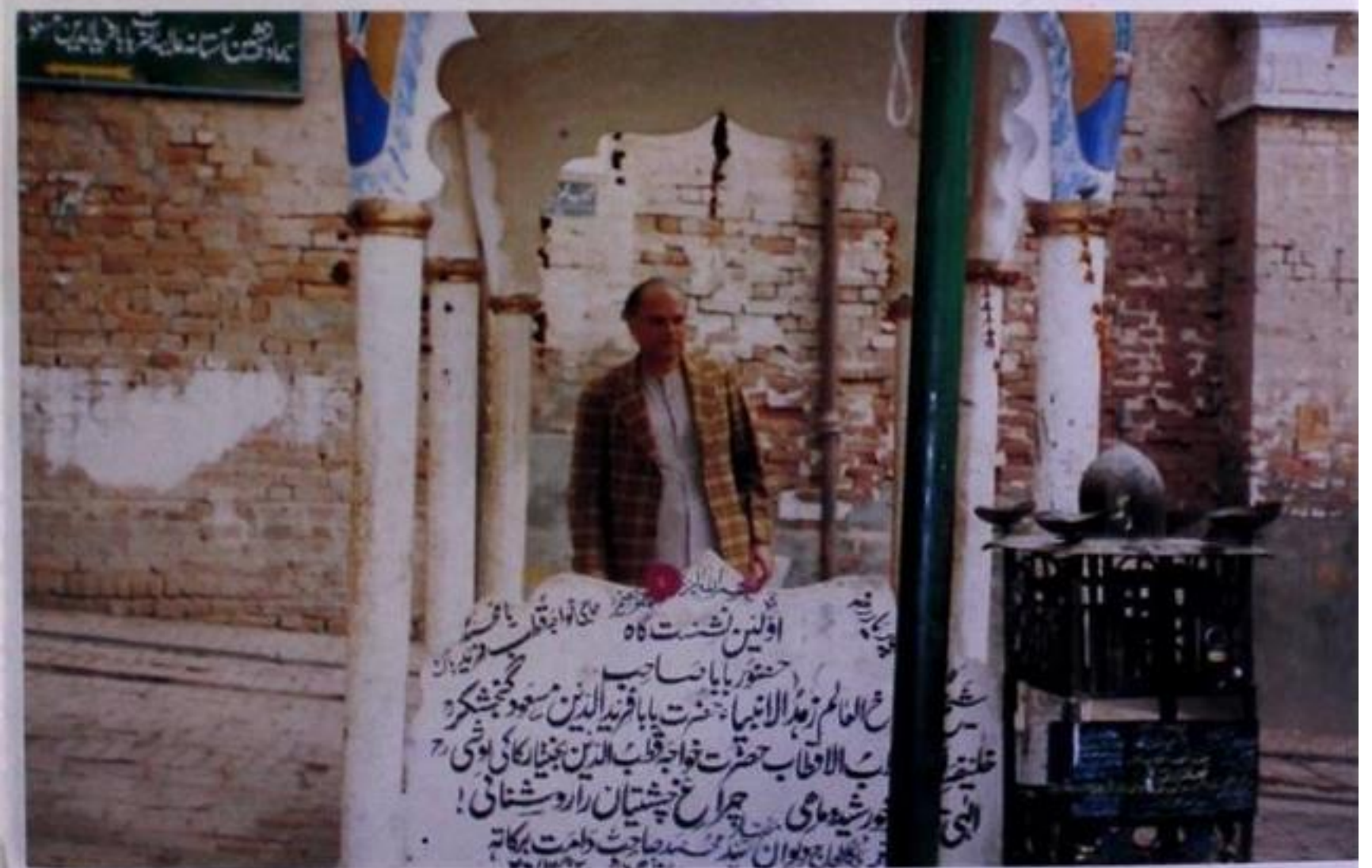
دہلی، ہانسی اور کھتوال چھوڑنے کے بعد فرید الدین مسعود اجودھن آگئے۔
یہاں سانپ، بچھوؤں، درندوں اور ''جانگلیوں'' کا قرب تھا لیکن قرب سلطانی کا دھڑکا نہ تھا۔

پاک پتن میں فریدالدین مسعود کے حقیقی بھانجے مخدوم علاؤالدین صابر کے حجرے کی جگہ۔

نوے سال پہلے آسمان نے زمین کو جو امانت سونپی تھی، آج زمین نے بہ صد احترام وہ آسمان کو لوٹا دی۔
خاک کو امانتِ خاک کے سپرد کر دیا گیا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء اجودھن پہنچے تو مرشد کا جسد پاک اس لحد سے نکال کر جہاں اسے امانتہً رکھا گیا تھا،
زمین کے اس ٹکڑے کو سونپا جو زندگی میں ان کی رہائش گاہ اور بعد میں ان کی خواب گاہ کے لیے مقدر کیا گیا تھا۔

کہتے: "لوگو! سنو! میرے پاس ایک ایک کر کے تسلی سے آؤ تاکہ میں ہر سائل کے مسائل پر الگ الگ اور پوری توجہ دے سکوں۔" اکثر کہا کرتے کہ جب تک میرے حجرے کے باہر ایک سائل بھی بیٹھا ہو، مجھے عبادت میں لطف نہیں آتا۔

اللہ کے بندوں سے باتیں ختم ہوتیں تو اللہ سے باتیں شروع ہو جاتیں۔ اب وہی حجرہ، وہی بندہ، وہی درد و سوز، وہی شعر اور وہی سجدے، وہی سبکیاں، سسکیاں اور سرگوشیاں۔ راز و نیاز کی وہی محفلیں اور کیف و مستی کی وہی مجلسیں، خلوتوں میں وہی جلوتیں اور جلوتوں میں وہی خلوتیں۔

افطار کا وقت آتا تو چوبیس گھنٹے بھوکے پیاسے رہنے کے بعد، اس درویش خدامست کے سامنے جو افطاری پیش کی جاتی، وہ شربت کا ایک پیالہ ہوتا جس میں سوکھی سرخ کشمش کے گنے چنے دانے پڑے ہوتے اور اس کے ساتھ گھی میں چپڑی ہوئی سو سو گرام کی جوار کی دو موٹی موٹی روٹیاں۔ شربت کے تہائی یا آدھے پیالے سے اپنی دن بھر کی پیاس بجھاتے۔ باقی آدھے یا دو تہائی پیالے کو گھونٹ گھونٹ پی کر، آبِ کوثر پینے کی تمنا دل میں لیے، خدا جانے، کیسے کیسے اور کون کون سے لوگ، کہاں کہاں سے آئے، کب کب سے بیٹھے ہوتے۔ جوار کی ایک روٹی حاضرین میں تبرکاً بٹ جاتی۔ شربت کے پیالے کی طرح، دوسری روٹی بھی کبھی آدھی اور کبھی تہائی خود کھاتے۔ باقی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نصیبے والوں کے پیٹ میں پڑتی۔ مغرب کی نماز باجماعت ہوتی اور پھر وہی محفل سج جاتی جس میں اِدھر مسعود ہوتا، اُدھر اُس کا معبود ہوتا اور دونوں کے بیچ میں خدا جانے کیا ہوتا یا نہ ہوتا۔

پاک پتن کا آسمان روشن تاروں سے جگمگا اٹھتا تو جماعت خانے میں عشائیے یعنی **DINNER** کے لیے زمین پر سرخ کپڑے کا دستر خوان بچھا دیا جاتا۔ روشنی کے لیے جماعت خانے کے ایک طاق میں، سرسوں کے تیل سے بھرا مٹی کا ایک

دیا رکھا ہوتا جس میں پرانی روئی کی پتلی اور پیلی بتی سے سکون بخش ٹھنڈی روشنی نکلتی جو رات کی رانی کی خوشبو کی طرح پورے جماعت خانے میں پھیل جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ عشائیہ یعنی ڈنر تو ہے مگر دستر خوان نہیں۔ ایسے موقعوں پر ڈنر زمین پر ہی چُن دیا جاتا۔ کبھی ایسا بھی وقت پڑتا کہ دستر خوان تو موجود ہوتا مگر عشائیہ نہیں۔

اور یہ ڈنر ہوتا کیا تھا؟ خواجہ نظام الدین اولیاء کے الفاظ میں ''جس رات ہمیں شیخ کے گھر پیٹ بھر کر ''ڈیلے'' کھانے کو مل جاتے، وہ ہمارے لیے عید کا دن ہوتا۔'' ڈیلے ایک جنگلی پھل کا نام ہے جو ان دنوں پاک پتن کے آس پاس کے جنگلات میں ''کریل'' نام کے درختوں پر خوب اگتا تھا۔ یہ درخت آج بھی پاک پتن کے قدیم قبرستان کے علاوہ، پاک پتن سے دیپال پور جانے والی شاہراہ پر نظر آتے ہیں۔ مقامی لوگ اس درخت کو اب ''کری'' کہتے ہیں لیکن اس کا پھل آج بھی ''ڈیلے'' ہی کہلاتا ہے اور اس کا اچار بنایا جاتا ہے۔

ہر ایک کو کھلاتے، گو اکثر خود کچھ نہ کھاتے۔ انگور بہت پسند تھے لیکن نفس کُشی کی وجہ سے کم ہی کھاتے۔ کبھی کبھی پان بھی کھالیتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پان کھانے کا رواج کم از کم آٹھ سو سال پرانا ہے۔ کھانے کے بعد عشاء کی نماز باجماعت ادا کی جاتی اور اس کے بعد اس درویشِ خدامست کی کُٹیا میں اس کی پرانی کھٹیا ڈال دی جاتی۔ وہ پھٹا پرانا کمبل جسے اوڑھ کر، یا جس پر بیٹھ کر، سارا دن گزارا تھا، اب اس کھٹیا پر گدیلے یا توشک کا کام دیتا، تاہم کھٹیا کی پائنتی پر ایک چادر بچھانی پڑتی کیوں کہ یہ پرانا کمبل اتنا چھوٹا تھا کہ پوری چارپائی نہیں ڈھانپ سکتا تھا۔ اگر رات کی کسی گھڑی، پائنتی پر پڑی یہ چھوٹی سی چادر کھسک جاتی یا اسے اوپر اوڑھ لیتے تو ضعیف، بوڑھے اور مقدس پاؤں کے نیچے کوئی بچھونا نہ ہوتا، صرف اور صرف کُھری چارپائی ہوتی۔ ان کے پیرو مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے جو عصا عطا کیا تھا، اسے اپنے سرہانے

رکھتے جس پر سَر رکھنے سے پہلے، کبھی عصا پر عقیدت سے ہاتھ پھیرتے تو کبھی اسے محبت سے چومتے۔ اس پر اپنا سفید، ضعیف، تھکا ماندہ سَر رکھ کر، اپنے محبوب فارسی اشعار گنگنانا شروع کر دیتے جن کا مفہوم ہے:

''میرے محبوب! میری بس ایک ہی آرزو رہ گئی ہے کہ جب تک جیوں، صرف تیری یاد میں جیوں اور جب مروں تو تیرے قدموں میں گر کر تجھے دیکھنے کے لیے زندہ ہو جاؤں۔ مجھے بتا تو سہی کہ دونوں جہاں میں تیرے سوا میرا بھلا اور کون ہے؟ میں جیتا ہوں تو صرف تیرے لیے، مرتا ہوں تو صرف تیرے لیے۔''

اور پھر ہر رات کی طرح جیسے جیسے فضا میں سکوت اور سکون طاری ہوتا جاتا، فریدالدین مسعود کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ کبھی اپنے دل پسند شعر پڑھتے ہوئے چہل قدمی، کبھی سوز و درد، کبھی پیچ و تاب، کبھی مرشد کے عصا کے والہانہ بوسے، کبھی سبکیاں اور سسکیاں، کبھی سجدہ ریزی، کبھی وجد، کبھی پارے کی سی تڑپ اور کبھی رقصِ بسمل۔

ہر رات کی طرح یہ رات بھی بیت جاتی اور پھر ہر صبح کی طرح پاک پتن کی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوتی۔ لکڑی کا دروازہ حسب معمول آہستہ سے اندر کی طرف کھلتا۔ تاروں کی چھاؤں اور صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں یہ نوّے سالہ درویش باہر آتا اور مسجد کی طرف روانہ ہو جاتا۔ سیکڑوں نظریں ان کی سر سے پاؤں تک بلائیں لیتیں۔ سیکڑوں ہاتھ بے اختیار ایک ساتھ سلام کے لیے اٹھتے۔ کتنی آنکھیں تھیں جو بھیگ جاتیں، کتنے دلوں کی دنیا دیکھتے دیکھتے بدل جاتی...... اور وقت تھم جاتا، ساکت ہو جاتا، ساکن ہو جاتا کہ اللہ اکبر! اِمامت کے لیے امامِ وقت خود چلا آ رہا ہے۔

۱۹۷۳ء میں سرحد پار بھارتیوں نے وہ کیا جس کی توفیق پاکستانیوں کو آج تک نہ ہو سکی۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں، بابا فرید میموریل سوسائٹی پٹیالہ نے بابا صاحب کا آٹھ سو سالہ جشنِ وِلادت دہلی، اجمیر اور لکھنؤ میں بڑی دھوم دھام سے منایا جس میں صدرِ

جمہوریہ ہند سے لے کر بھارت کے وزراء، سیاسی رہنما اور سرکاری عہدے دار سب ہی جوق در جوق شریک ہوئے۔ اس موقع پر بابا صاحب کی شان میں پانچ اشعار پر مشتمل ایک مختصر اور مشہور نظم پڑھنے کا اعزاز ایک سکھ کے نصیب میں آیا۔ اشعار یہ ہیں:

اے فرید الدین بابا، اے مرے گنج شکر
عالمِ الحاد تیرے خوف سے زیر و زبر
تو نے بخشا اِک جہاں کو بادۂ عرفاں کا نور
زُہد کا، اِخلاص کا، تسلیم کا، ایماں کا نور
راہِ حق سے اور حق سے تھی شناسائی تیری
اس لیے ہوتی ہے ہر دل میں پزیرائی تیری
ٹوٹ سکتا ہے نظامِ انجم و شمس و قمر
اور مٹ سکتے ہیں دنیا سے یہ دشت و بحر و بَر
لیکن اے گنجِ شکر تو زندہ و پائندہ ہے
کل بھی تابندہ رہے گا آج بھی تابندہ ہے

اس سکھ کا نام تھا: کنور مہندر سنگھ بیدی، اس کا تخلص تھا: سحر

واہگہ کے سرحد پار کا یہ نام اردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لیے اجنبی نہیں۔ یہ ایک انسان کے دل کی آواز ہے جس میں فریدالدین مسعود گنج شکر کی شخصیت اور ان کے پیغام کو یوں پیش کیا گیا ہے جیسے ایک دریا کو کوزے میں بند کر کے پیش کیا جائے۔ بے شک جس انسان میں یہ سب اوصاف یک جا ہو جائیں، وہ اس شان سے زندہ رہتا ہے کہ نظامِ کائنات تو ٹوٹ سکتا ہے لیکن وہ انسان زندہ، پائندہ اور تابندہ رہتا ہے۔ اس کی خواب گاہ پر صدیوں سے یہ سرمدی نعرہ گونجتا رہا ہے اور گونجتا رہے گا:

حق فرید یا فرید   حق فرید بابا فرید .

حوالہ جات

[۱] (i) فوائد الفواد (فارسی قلمی نسخہ) (Persian Society Collection No:239)

مصنف: امیر حسن علاء سجزی، سنہ کتابت: ۱۱۰۷ھ مطابق ۱۶۹۵ء (عہد عالمگیری میں کتابت شدہ)، یہ مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کول کتا کے میوزیم میں ہے۔

(ii) فوائد الفواد (فارسی مطبوعہ) مرتب: محمد لطیف ملک، سنہ اشاعت ۱۹۶۶ء

ناشر: سراج الدین اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور

(iii) فوائد الفواد (اردو ترجمہ) مترجم: محمد سرور، سنہ اشاعت ۱۹۸۰ء

ناشر: علماء اکیڈمی، محکمہ اوقاف، بادشاہی مسجد، لاہور

(iv) فوائد الفواد (اردو ترجمہ)، مترجم: خواجہ حسن ثانی نظامی، سنہ اشاعت: ۲۰۰۱ء

ناشر: اردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی

[۲] (i) سیر الاولیاء (فارسی قلمی نسخہ) (Persian Society Collection No:243)

مصنف: سید محمد بن مبارک کرمانی (امیر خورد کرمانی)، کتابت: ۱۰۱۳ھ مطابق ۱۶۰۵ء (اکبر کے عہد کے آخری سال میں ہوئی)، ۳۵۹ اوراق / ۷۱۷ صفحات پر مشتمل ''سیر الاولیاء'' کا یہ قدیم ترین معلومہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی میوزیم کول کتا، بھارت میں ہے۔

(ii) سیر الاولیاء (فارسی قلمی نسخہ) (Delhi Persian-668 as in C. A.Storey)

کتابت ۱۰۹۳ھ مطابق ۱۶۸۲ء عالم گیر کے عہد میں ہوئی، ۳۰۲ اوراق / ۶۰۳ صفحات پر مشتمل ''سیر الاولیاء'' کا یہ دوسرا قدیم ترین مصدقہ قلمی نسخہ برٹش لائبریری لندن میں ہے

(iii) سیر الاولیاء (فارسی قلمی نسخہ)، سنہ کتابت نہیں دیا، ۲۰۷۶ صفحات پر مشتمل یہ قلمی نسخہ قومی عجائب خانہ کراچی میں ہے۔

(iv) سیر الاولیاء (فارسی مطبوعہ)، سنہ اشاعت: ۱۹۷۸ء، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، موسسہ انتشارات اسلامی، این ۲۴۹ سمن آباد، لاہور

(v) سیر الاولیاء (اردو ترجمہ) مترجم: اعجاز الحق قدوسی، پانچواں اڈیشن: ۲۰۰۴ء، ناشر: اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹، اپر مال، لاہور

[۳] تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) مصنف: ضیاء الدین برنی، مترجم: ڈاکٹر سید معین الحق چوتھا اڈیشن: ۲۰۰۴ء، ناشر: اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹، اپر مال، لاہور

[۴] تاریخ مبارک شاہی، مؤلف: یحیٰی بن احمد سرہندی، مترجم: ڈاکٹر آفتاب اصغر پہلا اڈیشن: ۱۹۷۶ء، دوسرا اڈیشن: ۱۹۸۶ء

ناشر: اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹، اپر مال، لاہور

[۵] آئین اکبری (اردو ترجمہ)، مصنف: ابوالفضل، مترجم: محمد فدا علے طالب ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور، سنہ اشاعت نہیں دیا،

[۶] (i) اخبار الاخیار (فارسی مطبوعہ) مصنف: شیخ عبدالحق محدث دہلوی،

سنہ اشاعت: ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء، ناشر: مطبع مجتبائی، دہلی

(ii) اخبار الاخیار (اردو ترجمہ)، مترجم: محمد لطیف ملک، پہلا اڈیشن: 1958ء، دوسرا اڈیشن: ۱۹۶۲ء، ''انوار صوفیہ'' کے نام سے شعاع ادب لاہور سے شائع ہوا۔

(iii) اخبار الاخیار (اردو ترجمہ)، مترجم: اقبال الدین احمد، سنہ اشاعت: 1997 ناشر: دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی

[۷] جواہر فریدی (اردو ترجمہ)، مصنف: مولانا محمد علی اصغر چشتی، مترجم: ملک فضل الدین نقشبندی، ناشر: اللہ والے کی قومی دکان، کشمیری بازار، لاہور، سنہ اشاعت نہیں دیا

[۸] (i) مخبرالواصلین (فارسی قلمی نسخہ)

Persian Society Collection No:759

مصنف: ابوعبداللہ محمد فاضل بن سید احمد بن سید حسن حسینی ترمذی اکبر آبادی

کتابت: ۱۱۵۱ھ (مطابق ۱۷۳۸ء)

اس کی تالیف شاہجہاں کے عہد میں ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۰ء میں شروع ہوئی اور اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں مکمل ہوئی۔ یہ مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کول کتہ کے میوزیم میں ہے۔

(ii) مخبرالواصلین (فارسی مطبوعہ) ناشر: کتب خانہ نذیریہ، مسلم منزل، کھاری باؤلی دہلی، سنہ اشاعت نہیں دیا۔

[۹] مرآۃ الاسرار (اردو ترجمہ) مصنف: شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مترجم: کپتان واحد بخش سیال، ناشر: الفیصل، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، سنہ اشاعت نہیں دیا۔

[۱۰] سفینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ)، مصنف: داراشکوہ، مترجم: محمد علی لطفی پہلا اڈیشن: ۱۹۵۹ء، پانچواں اڈیشن: ۱۹۷۵ء، نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ، کراچی

[۱۱] خزینۃ الاصفیاء (اردو ترجمہ)، مصنف: مفتی غلام سرور لاہوری مترجم: اقبال احمد فاروقی، فارسی اڈیشن: ۱۸۷۳ء، اردو ترجمہ: ۱۹۹۰ء ترجمے کے ناشر: مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور

[۱۲] تاریخ فرشتہ (فارسی مطبوعہ)، مصنف: محمد قاسم ہندو شاہ، سنہ اشاعت: ۱۸۶۴ء ناشر: منشی نول کشور، لکھنؤ

[۱۳] آب کوثر، مصنف: شیخ محمد اکرام، پہلا اڈیشن: ۱۹۳۷ء سولھواں اڈیشن: ۱۹۹۴ء ناشر: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور

[۱۴] بزم صوفیہ، مصنف: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، پہلا اڈیشن: ۱۹۵۰ء

دوسرا اڈیشن: ۱۹۷۱ء، مطبع معارف، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،، اعظم گڑھ، بھارت
[۱۵] تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ سوئم)، مصنف: سید ابوالحسن علی ندوی
ناشر: مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی، سنہ اشاعت نہیں دیا
[۱۶] سوانح عمری حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر، مصنف: وحید احمد مسعود فریدی
پہلا اڈیشن: ۱۹۶۵ء، ناشر: پاک اکیڈمی، وحید آباد، کراچی
دوسرا اڈیشن: ۱۹۹۶ء، ناشر: ضیاالقرآن، داتا گنج بخش روڈ، لاہور
[۱۷] تقویم ہجری وعیسوی، مرتب: ابوالنصر محمد خالدی، تیسرا اڈیشن: ۱۹۷۴ء
ناشر: انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی
[۱۸] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد نمبر ۱۵: ۱۹۷۵ء، جلد نمبر ۵: ۱۹۸۵ء
ناشر: دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور
[۱۹] آکھیا بابا فرید نے (پنجابی)، مؤلف: محمد آصف خان، پہلا اڈیشن: ۱۹۷۸ء
دوسرا اڈیشن: ۱۹۸۶ء، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۵۸، لارنس روڈ، لاہور
[۲۰] مقام گنج شکر، مصنف: کپتان واحد بخش سیال، پہلا اڈیشن: ۱۹۷۹ء
دوسرا اڈیشن: ۱۹۸۸ء، ناشر: بختیار پرنٹرز، دربار مارکیٹ، گنج بخش روڈ، لاہور
[۲۱] احوال وآثار شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (اردو ترجمہ)، مصنف: خلیق احمد نظامی
مترجم: قاضی محمد حفیظ اللہ، سنہ اشاعت: ۱۹۸۳ء، ناشر: المعارف، گنج بخش روڈ، لاہور
[۲۲] فکر فرید، مصنف: سلیم یزدانی، سنہ اشاعت: ۱۹۸۵ء
ناشر: ڈینز پبلی کیشنز، D/I/3 جیکب لائنز، کراچی
[۲۳] اللہ کے سفیر، مصنف: خان آصف، پہلا اڈیشن: ۱۹۹۷ء، چوتھا اڈیشن: ۲۰۰۱ء
ناشر: اخبار جہاں پبلی کیشنز، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی
[۲۴] پیام گنج شکر، مصنف: ڈاکٹر منظور ممتاز، سنہ اشاعت: ۱۹۹۹ء، ناشر: نذیر سنز لاہور

[۲۵] فرمایا خواجہ گنج شکرؒ نے، مصنف: ڈاکٹر اسلم فرخی، پہلا اڈیشن: ۲۰۰۱ء
دوسرا اڈیشن: ۲۰۰۱ء، ناشر: شہرزاد، ۵/۱۵۵ گلشن اقبال کراچی

[۲۶] زندگی نامہ بابا فرید گنج شکر، مصنف: سید افضل حیدر، سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء
ناشر: دوست پبلی کیشنز، ۸۔اے خیابان سہروردی، اسلام آباد

[۲۷] چلہ گاہیں، مصنف: محمد اجمل چشتی فاروقی، سنہ اشاعت: ۲۰۰۳ء
ناشر: فرید منزل، چشتیاں، ضلع بہاول نگر

[۲۸] حضرت بابا فرید گنج شکر، مصنف: سید نصیر احمد جامعی،
ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، سنہ اشاعت نہیں دیا

[۲۹] تذکرہ حضرت بابا فرید گنج شکر، مصنف: طالب ہاشمی
ناشر: شعاع ادب، مسلم مسجد، لاہور، سنہ اشاعت نہیں دیا،

[۳۰] انوار الفرید المعروف بہ تاریخ فریدی،، مصنف: سید مسلم نظامی دہلوی
ناشر: بیت الفرید، اردو منزل، پاک پتن، سنہ اشاعت نہیں دیا

[۳۱] مشائخ چشت، مصنف: نور احمد خان فریدی
ناشر: قصر ادب رائٹرز کالونی، ملتان، سنہ اشاعت نہیں دیا

[۳۲] شاہ رکن عالم ملتانی سہروردی قدس سرہ، مصنف: نور احمد خان فریدی
ناشر: قصر ادب، رائٹرز کالونی، ملتان، سنہ اشاعت نہیں دیا

[۳۳] تاریخ ملتان، مصنف: نور احمد خان فریدی
ناشر: قصر ادب، رائٹرز کالونی، ملتان، سنہ اشاعت نہیں دیا

[۳۴] ماہنامہ منادی دہلی، مضمون نگار: نثار احمد فاروقی فریدی، شمارہ: ستمبر ۱۹۷۴ء
درگاہ نظام الدین، نئی دہلی

[۳۵] ماہنامہ جہان چشت، مضمون نگار: نثار احمد فاروقی فریدی، شمارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء

R-859, Sector 15/ A/ 2, Buffer Zone, Karachi,

[۳۶] ماہنامہ معارف، مضمون نگار: نثار احمد فاروقی فریدی، شمارہ: جولائی ۲۰۰۳ء
دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، بھارت

[37] A NEW HISTORY OF INDIA
Author : STANLEY WOLPERT
3rd edition:1989, Publisher: Oxford University Press,
5- A Banglore Town, Karachi

[38] MORALS FOR THE HEART
(English translation of فوائد الفواد)
Author : Amir Hasan Sijzi,
Translator: Bruce. B. Lawrence,
Edition: 1992.
Macathur Boulevard Mahwah, New Jersey-07430, U.S.A.

[39] A HISTORY OF INDIA.
Author : V.D. MAHAJAN
2nd edition: 1996.
Publisher :S. Chand & Co Ltd, Ram Nagar,New Delhi.

[40] (i) THE LIFE AND TIMES OF
SHAIKH FARIDUDDIN GANJ-I-SHAKAR.
Author : Khaliq Ahmed Nizami.
Publisher: Universal Books, Lahore. سنہ اشاعت نہیں دیا
(ii)THE LIFE AND TIMES OF
SHAIKH FARIDUDDIN GANJ-I-SHAKAR.
Author : Khaliq Ahmed Nizami.
Edition: 1998,Publisher:Idara-i-Adabyat-i-Delli
2009,Qasim Jan Street, Delhi.

فیروزالدین احمد فریدی 29 اکتوبر 1937ء
(23 شعبان 1356ھ) کو دلی میں پیدا ہوئے۔
کراچی یونیورسٹی سے بی کام، ایم اے (معاشیات)
اور ایل ایل بی، ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم پی اے اور
قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی کیا۔
1962ء میں سول سروس میں آئے اور اکتوبر 1998ء
میں وفاقی حکومت کے سب سے سینیئر ایڈیشنل سیکریٹری
کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے اُردو مضامین پچھلی نصف صدی اور انگریزی مضامین پچھلے
چالیس برس سے پاکستان کے ممتاز روزناموں اور جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ اُردو
کی چار اور انگریزی کی ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

مصنف کی دوسری کتابیں

(۱) فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی ایک جھلک (پانچواں اڈیشن)

(۲) اوراق پریشاں (تیسرا اڈیشن)

۱۹۹۴ء سے پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں نے
اس کتاب کو اپنے تعلیمی اداروں کی لائبریری کے لیے منظور کیا ہے۔

(۳) رہے نام اللہ کا

(۴) Adventures in Self-Expression (2nd Edition)

ناشر: فاطمہ پبلی کیشنز
کھتوال ہاؤس، A-54، سٹریٹ نمبر 15، باتھ آئی لینڈ، کراچی ـ 75530
e-mail : firozuddin_ahmed@yahoo.com